قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل الاشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۴۸ روپے

غیر ممالک ——— ۱۱۰ روپے

ٹیلیفون

87 92 46

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ

۴

چار روپے

جلد (۴۱) — **فروری ۱۹۸۸ء** — **نمبر ۲**

فہرست

۱۔ لمعات ۲

۲۔ مفکرِ قرآن کی یاد میں (محترمہ ثریا عندلیب) ۸

۳۔ سیشن میں (مولانا) مسیح الحق کی کذب بیانی ۱۲

۴۔ ایک چراغ لاکھ اندھیرے
محترم پرویز صاحب ۱۸

۵۔ حقائق و عبر ۳۲
i۔ تیری آواز مکے اور مدینے
ii۔ جماعتِ اسلامی اور علماء
iii۔ اولیاء اللہ اپنا جنازہ خود پڑھتے ہیں
iv۔ فرقہ اہلِ حدیث کا ولی اللہ
v۔ دوسری صدی کا امام پانچویں صدی کے صوفی کا محتاج
vi۔ حضرت اور اعلیٰ حضرت
vii۔ جمہوریت خلافِ اسلام ہے

۶۔ تصوف کا منبع، قرآن و حدیث؟ ۳۸
(محترم محمد عمر دراز)

۷۔ پاکستان جل رہا ہے! ۴۱
(محترم محمد اسلام کراچی)

۸۔ دین کی باتیں ۵۹
(محترمہ ثریا عندلیب)

۹۔ قرآن بیش خود آئینہ آویزد ۶۳
کفر اور ایمان۔ قرآن کے آئینے میں
محترم محمد عمر دراز

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی، گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ: النور پرنٹرز، ۲/۲ فیصل نگر، ملتان روڈ، لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

تاریخ انسانیت کے مطالعہ سے یہ تلخ حقیقت بتکرار سامنے آتی ہے کہ جب بھی کوئی شخص، باطل ذرائع سے برسر اقتدار آیا تو اس نے یہی کہا کہ اُسے یہ منصبِ حکومت، خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ اسی بنا پر، کبھی ایسے حکمرانوں نے اپنے آپ کو ظِلّ اللہ کہلوایا اور کبھی اُن کی رعایا نے انہیں ظلِّ سُبحانی کہا۔ حصولِ اقتدار کے یہ طریق، آج بھی کسی نہ شکل میں موجود ہیں۔

ان کے علاوہ، دنیائے مذاہب میں، ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو نظریۂ تجسیم (INCARNATION) کا حامل ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ خدا، ان کے حکمرانوں کی شکل میں، خود زمین پر ظاہر ہوتا ہے۔ گویا ایسے حکمران، خدا کے اوتار ہیں کہ انسانوں کے سامنے آتے ہیں۔ اس بنا پر وہ لوگوں پر حکمرانی کرتے اور ان کی رعایا اُن کی فرماں پذیری ہی نہیں، پرستش کرتی ہے۔

انہی غاصب حکمرانوں میں سے، ادوارِ تاریخ میں، ایک ایسا حکمران بھی گذرا ہے جس نے نہ یہ کہا کہ اسے منصبِ حکومت خدا کی طرف سے ملا ہے اور نہ ہی وہ خدا کا اوتار بن کر ظاہر ہوا، بلکہ اس نے یہ کہا کہ ربکم الاعلیٰ (۷۹/۲۴)۔ میں خود سب سے بڑا رب ہوں۔

غور فرمایا آپ نے کہ صورت کیا بنی؟ پہلا طبقہ یہ کہتا ہے کہ انہیں مسندِ اقتدار، ان کے رب کی طرف سے ملی ہے۔ دوسرے نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ خدا کے اوتار ہیں۔ لیکن اس حکمران نے یہ اعلان کیا کہ وہ خود رب ہے اور وہ بھی سب سے بڑا۔ خدائے حقیقی نے اُسے سب سے بڑا مجرم قرار دیا ہے۔ یہ شخص تھا، حضرت موسیٰؑ کے وقت کا، مصر کا حکمران، فرعون رمیسس ثانی (RAMESES II)۔ اس کے ربِّ اعلیٰ کے دعویٰ ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس قدر جاہ و حشمت اور تسلط و دبدبہ کا مالک تھا۔ لیکن یہی ربکم الاعلیٰ کا دعویٰ کرنے والا فرعون، جب حضرت موسیٰؑ اور قوم بنی اسرائیل کے تعاقب میں ڈوبنے لگا تو انتہائی کس مپرسی اور بیچارگی

کے عالم میں پکار اٹھا کہ :-

قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ... (۹۰)

"میں ایمان لاتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ اس اللہ کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں بھی اس کے سامنے سر جھکانے والوں میں سے ہوں"

جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کہہ کر اس پر پھٹکار ہوئی کہ "آلْئٰنَ" کمبخت موت تیرے سامنے آئی تو، تو اپنے کفر پر بھی قائم نہ رہا اور کہتا ہے کہ میں ایمان لایا حالانکہ :-

وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَکُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (۹۱/۱۰)

تو اب تک سرکشی کرتا رہا اور تیرا شمار ان لوگوں میں رہا جو دنیا کے انسانیت کو فساد سے بھر دیتے ہیں۔ اب تو ہمارے قانونِ مکافات سے بچ نہیں سکتا کیوں کہ جب تیرے اقتدار و اختیار کا وقت ختم ہو چکا تو تیری توبہ کیسے قبول ہو سکتی ہے۔ یہ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے۔

وَلَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَهُمْ کُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝ (۴/۱۸)

"ان کے لئے توبہ (معافی) نہیں جو عادی مجرم ہوں اور اپنی حرکات پر اس وقت نادم ہوں جب موت ان کے سامنے آکھڑی ہو۔ نہ ہی ان کے لئے جو قانون کو سرے سے تسلیم ہی نہ کریں اور ساری عمر اسی سرکشی میں بسر کر دیں۔ انہیں دردناک سزا ملے گی"

کیونکہ توبہ کا مطلب ہے اپنی غلط روشِ زندگی کا احساس اور پھر قانونِ الٰہی کے مطابق صلاحیت بخش اعمال سے اس کی اصلاح۔ لہٰذا جس کے پاس اصلاح کا وقت ہی نہ ہو اس کی توبہ کچھ معنی نہیں رکھتی۔

اگرچہ اس فرعون (بلکہ ہر فرعون) کے جرائم کی فہرست طول طویل ہے جسے یہاں دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں، تاہم قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ :-

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا ...... اِنَّهٗ کَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (۲۸/۴)

"بلاشبہ فرعون نے زمین میں سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ اپنی قوت کو مستحکم رکھنے کے لئے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا اور ان میں سے ایک پارٹی کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جاتا تھا۔ اس کے لئے اس کی پالیسی یہ تھی کہ وہ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اسے جوہرِ مردانگی نظر آتے ذلیل و خوار کر کے غیر موثر بنا دیتا۔ اور جو ان جوہروں سے

جاری رہتے تھے، انہیں اُبھارتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس طرح وہ اس قوم میں ناہمواریاں پیدا کر کے ان کی قوت کو توڑتا چلا جاتا۔"

اس کی یہ تقسیم انسانیت ظلم عظیم تھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرعون کو "مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ" کہا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ فساد کسے کہتے ہیں۔

"فَسَادٌ" درحقیقت صَلَاحٌ کی ضد ہے۔ صَلَاحٌ کے معنی ہیں حالات کا مستقیم و متوازن رہنا۔ لہٰذا فَسَادٌ کے معنی ہوئے توازن کا بگڑ جانا۔ بے ترتیبی (DISORDER) پیدا ہو جانا۔

قرآن کریم نے "مُفْسِدِيْنَ" کے مقابلہ میں "مُصْلِحِيْنَ" کا لفظ استعمال کیا ہے (۲/۱۱)۔ حرث و نسل کو تباہ کر دینے کو بھی فَسَادٌ قرار دیا ہے (۲/۲۰۵)۔ ماپ تول کو پورا نہ رکھنا۔ دوسروں کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دینا۔ معاشی ناہمواریاں پیدا کر دینا۔ لوگوں کے حقوق کو دبا لینا، یہ سب فَسَادٌ ہے (۷/۸۵، ۲۶/۱۸۳)۔ صالح نظام کو درہم برہم کر دینا، صحیح ترتیب کو الٹ دینا بھی فَسَادٌ ہے (۲۷/۳۴)۔ رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر کے معاشرہ کا توازن بگاڑنا (۲/۳۰) بھی فَسَادٌ ہی کے زمرے میں آتا ہے۔

غور فرمایئے کہ جسے قرآن کریم نے انسانیت کا اتنا بڑا مجرم قرار دیا ہے وہ اُن لوگوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کرتا ہوگا جو اس کی رعایا تھے اور جن پر اُسے کامل تصرف حاصل تھا۔

اب آگے بڑھیئے! جب کسی معاشرہ میں ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو جائے اور کوئی شے اپنی اصلی حالت پر نہ رہے تو اس کا لازمی نتیجہ مایوسی ہوتا ہے۔ مایوسی یعنی FRUSTRATION میں کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات کو سدھارنے کے لئے کیا کیا جائے۔ پوری قوم کی قوم ایک دوسرے کو موردِ الزام قرار دینے میں مصروف رہتی ہے۔ لیڈر، عوام کو کوستے ہیں۔ تو عوام اپنے لیڈروں کو یہ کہہ کر مطعون کرتے ہیں کہ وہ بالکل نکمے اور بے ایمان ہیں ——— قرآن کریم یہ بھی بتاتا ہے کہ ہر نسل (زمانہ) کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم سے پہلے والوں نے جو جرائم کئے، ہمیں ان کی سزا مل رہی ہے۔ ساتھ ہی قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ یہ عذر تراشیاں بے معنی ہیں۔ اگر تم سے پہلوں نے غلطیاں کی تھیں تو تم خود ان کا ازالہ کیوں نہیں کر لیتے۔ خاص کر تم میں سے وہ جو مسندِ اقتدار پر قابض ہیں، انہیں ایسا کہنے کی بجائے، اپنی قوتِ اقتدار کو بروئے کار لا کر اصلاحِ معاشرہ کرنے میں کون سی چیز مانع ہے۔ اگر تمہارے اسلاف نے جرائم کئے تھے تو تم بھی تو، سب کچھ سمجھتے بوجھتے اور ان کی اصلاح کرنے کی قوت رکھتے ہوئے، غلط معاشرہ کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنے کے مجرم ہو۔

آیئے اب پاکستان کے حالات پر ایک نظر ڈالیں۔ پاکستان ایک متاعِ گراں بہا ہے جو ہمیں فطرت کی طرف سے بطور نعمت ملی اور جس کے حصول میں، بانیٔ پاکستان علیہ الرحمۃ کا خونِ جگر بھی شامل ہے لیکن ہم نے اس کی سخت ناقدری کی اور خدا سے کئے ہوئے اپنے وعدوں کو پسِ پُشت ڈالتے ہوئے، اس کے اندر قوانینِ خداوندی کے نفاذ اور ان کے اتباع سے گریز کی راہیں ڈھونڈتے رہے اور اس طرح ہم نے اپنے لئے وہ جہنم پیدا کر لیا جس میں آج ہم سب جھلس رہے ہیں۔ اس عذاب میں گرفتار ہم اپنے سے پہلی قوموں کی طرح کبھی گذر جانے والوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور کبھی آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے ہیں اور یہ کچھ کرتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی۔ ہم اسی اندھیرے میں مگن رہتے ہیں اور اس جہنم کے شعلے دن بدن بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ سوچنا نہیں چاہتا کہ اس صورتِ حال کا بنیادی سبب قانونِ خداوندی سے روگردانی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس جہنم سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہے؟ اگر آپ بنگاہِ تعمق اپنے معاشرہ کے حالات پر غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس میں کوئی ایسا خاص پرزہ نہیں جس کے بدل دینے سے اصلاحِ احوال ہو جائے۔ یہ خرابی اس پورے کے پورے نظام میں ہے جو غیر قرآنی خطوط پر متشکل ہے مفاد پرست گروہ، اپنی جگہوں پر، دن رات ایسی سازشوں میں مصروف رہتے ہیں کہ مستقلاً ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن میں عوام کا، قوانینِ الٰہی کے اتباع کا جذبہ پنپنے نہ پائے اور موجودہ باطل نظام قائم رہے تاکہ وہ محنت کرنے والوں کا اسی طرح استحصال کرتے رہیں لیکن خدا کا قانونِ مکافات ہر فرعون کے لئے ایک صاحبِ ضربِ کلیم پیدا کر دیتا ہے۔ دریں حالات یہ کرنا ہوگا کہ اپنے غیر قرآنی نظام کی جگہ خدا کے عطا فرمودہ، قرآن کریم کی دفتین کے اندر محفوظ "الدین" کو نافذ اور متمکن کیا جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس مقصد کو حاصل کس طرح کیا جائے تو اس کے لئے سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس کے لئے ایک اور صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ——— ہمیں سنتِ رسول اللہؐ پر عمل کرنا ہوگا۔ اور وہ یہی ہے کہ مسلسل تعلیم سے عوام کو قرآن کے عطا کردہ فلسفۂ حیات اور اس پر مبنی نظامِ ربوبیت سے اس طرح روشناس کرایا جائے کہ اس کا قیام، ہر فرد امت کے دل کی آرزو بن کر ابھرے۔ جب تک یہ نہیں ہوتا، اصلاحِ احوال کی کوئی دوسری صورت نہیں کہ:

یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

طلوعِ اسلام، کہ جس نے تحریکِ حصولِ پاکستان میں اس لئے بھرپور حصہ لیا تھا کہ اس مملکت کے حصول سے اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ نظامِ زندگی (رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔ الدین) کا قیام عمل میں آ سکے

گا۔مقدر بھراس مقدس فریضہ کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف ہے کہ خالص قرآنی تعلیمات کو عام کرکے، اُس نظام کے قیام کے لئے راہیں ہموار کی جائیں جو اس مملکتِ خداداد کے لئے وجہِ جواز ہے۔ بتوفیقِ ایزدی، اس کی ان کوششوں سے، ان افراد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے (اور ان حدود میں روز بروز وسعتیں آرہی ہیں) جو اس نظام کے قیام کو اپنی زندگی کا مسلک ومقصد قرار دیتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کی سابقہ کنونشن منعقدہ (لاہور) اپریل ۱۹۸۷ء اور اس کی یورپی کنونشن منعقدہ (لندن) اگست ۱۹۸۷ء، اس امر کی زندہ شہادت ہیں کہ اس تحریک سے وابستہ افراد کے دلوں میں اس نظام کے قیام کی آرزوئیں کس شدت سے مچل رہی ہیں۔ اور یہ حقیقت قابلِ صدستائش اور لائقِ ہزار تحسین ہے کہ ان کے پیشِ نظر، عام روش کے خلاف، اپنا کوئی مفاد نہیں حتیٰ کہ نام ونمود کی بھی کوئی خواہش نہیں کیونکہ ان کے سامنے تو اُسوۂ رسولِ اعظمؐ ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ۲۶/۱۰۹

میں اس کے لئے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو تمام عالم کے رب کے ذمہ ہے۔

اراکینِ طلوعِ اسلام بھی اپنے رب سے اس کے سوا کوئی اجر نہیں مانگتے کہ وہ، اُن کی ان کوششوں کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے انہیں ہمہ گیریت کی وسعتیں عطا فرمائے تاکہ یوم الدین (جب تمام انسانیت اپنے پروردگار کی ربوبیت عالمینی کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی (۳۹/۶۹)، اور جس دور میں حکومت صرف قوانینِ خداوندی کی ہوگی ۸۲/۱۹) کو قریب تر لایا جا سکے۔

اراکینِ طلوعِ اسلام، یہ بھی جانتے ہیں کہ اس فریضہ کی انجام دہی، کس قسم کی کوہکنی کی طلب گار ہے اور اس راستہ میں کن سنگلاخ وادیوں سے گذرنا ہوگا اور کیسی کیسی خاردار جھاڑیوں سے اپنے دامن کو بچانا ہوگا۔

یہ امر یقیناً حیران کن ہے کہ جب آپ قرآنِ خالص کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اور دعوت بھی سب سے پہلے قرآن کو ماننے والوں کو ہی دیتے ہیں، اس میں نہ کسی فرقہ یا پارٹی سے متصادم ہوتے ہیں۔ نہ اس کے بدلے میں کچھ مانگتے ہیں اور نہ ہی کوئی ذاتی مفاد اپنے سامنے رکھتے ہیں اور یہ فریضہ خالصتاً لوجہ اللہ انجام دیتے ہیں تو اس کی اس قدر مخالفت کیوں کی جاتی ہے! یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے جب اس کا تجزیہ کیا جائے کہ اس کی مخالفت، ان مفاد پرست گروہوں کی طرف سے ہوتی ہے جنہیں قرآن ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کہہ کر پکارتا ہے (یہی تو فرعونیت کے قیام کا باعث ہیں) کیونکہ قرآنی نظامِ ربوبیت کے قیام سے ان کی ہوسِ خون آشامی کی راہیں مسدود ہو جاتی، ان کی جھوٹی سیادت وقیادت ختم ہو جاتی اور خدا [illegible] کے بندوں کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں رہتی۔ اس لئے یہ تینوں (عہدِ فرعون کی طرح) متحدہ محاذ [illegible] کرتے ہیں۔ اپنی خون آشامیوں اور فریب کاریوں کے بے نقاب ہونے پر یہ آپ

پر طرح طرح کی الزام تراشیاں اور کذب بیانیاں کرتے ہیں۔ لیکن جو افراد اس انقلاب کے ایام کے لئے اٹھتے ہیں انہیں ان کے ان ہتھکنڈوں کی کوئی پرواہ نہ کرنا چاہیئے اور ان کی شکست خوردہ ذہنیتوں کی اظہار بیون کا کوئی اثر نہیں لینا چاہیئے۔ کیونکہ ان سے کہیں زیادہ گھناؤنے اور تکلیف دہ الزامات ان قوتوں نے محسنِ انسانیت حضور نبی اکرمؐ پر یہ کہہ کر لگائے کہ آپؐ (معاذ اللہ) ساحر ہیں، کاذب ہیں، شاعر ہیں، مجنون ہیں اور مسحور وہ ہیں۔ حالانکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان میں سے ایک ایک الزام کی نفی کی ہے۔ اور کہا ہے کہ آپ عظمت کردار کے جگمگاتے چراغ ہیں جن کی ذاتِ اقدس واعظم، رہتی دنیا تک، تمام اقوامِ عالم کے لئے اسوۂ حسنہ و بہترین نمونہ ہے۔

محترم پرویز صاحب، اپنے رفقاء کو اقبال کی ہمنوائی میں ہمیشہ یہ دلاسہ دیتے رہے کہ

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب ‏ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

انہوں نے قرآن کی راہ اختیار کرنے والوں کو یہ کہہ کر منشورِ عمل دیا کہ آپ کے پیشِ نظر پاکستان کی فضا کو تعلیماتِ قرآنی سے صاف کرنا، عوام میں پھیلے ہوئے باطل نظریات کے اندھیروں کو نورِ قرآن سے دور کرنا اور قرآنی نظام کے لئے راہ ہموار کرنا ہے تاکہ پاکستان میں وہ نظامِ زندگی قائم ہو سکے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا۔

یہ ہے پیغام اس محرمِ راز کا، اراکینِ طلوعِ اسلام کے نام بالخصوص اور ملتِ پاکستانیہ کے نام بالعموم۔۔۔ اور اسی سے ہمارے وہ وعدے ایفا ہو سکتے ہیں جو ہم نے تحریکِ حصولِ پاکستان کے دوران اپنے ربّ سے کئے تھے۔ اس کے سوا کوئی اور راہِ نجات، کوئی طریقِ فلاح نہیں۔ اور یاد رکھیئے کہ اللہ تعالیٰ نہ تو خود وعدہ خلافی کرتے ہیں (۳/۹) اور نہ ہی وعدہ خلافی کرنے والوں کو معاف کرتے ہیں۔

بقیہ (مولانا) سمیع الحق کی سینٹ میں کذب بیانی۔ از صفحا

کیا ایسے کردار کے مالک (بزعمِ خویش) علمائے کرام کا اس پر ایمان نہیں کہ ہم سب کو ایک دن عادلِ مطلق کے حضور پیش ہونا ہے، جہاں ہم سے ایک ایک قول، فعل اور عمل کا حساب لیا جائے گا۔ ایسی کذب بیانیوں اور تراشیوں کے بعد — یہ لوگ کس منہ سے خدا کے سامنے جائیں گے! یا پھر "حیاتِ آخرت" اور "لقائے رب" حضرات کے نزدیک لفظی اقرار سے زیادہ کوئی معنی نہیں رکھتا!

ثریا عندلیب

زندۂ جاوید

مفکرِ قرآن ہمارے باباجیؒ کی یاد میں

ہمارے معلّم مشفق (ہمارے باباجیؒ) کو اپنی حیاتِ طبعی کے حوالے سے ہمارا ساتھ چھوڑے پورے تین سال گزر گئے اور پھر وہی مہینہ آگیا جس میں ہمیں اپنے باباجی کی مفارقت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا۔ دن رات کی گردش میں جب کسی عزیز ہستی کے بچھڑ جانے کی تاریخ اور دن --- پلٹ کر آتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ صدمہ ابھی گزرا ہو، وہ زخمِ دل ابھی لگا ہو۔ ایسے میں جذبات پر قابو رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے؟ دل سے یہ پکار اٹھتی ہے، کاش! ایسا نہ ہوتا! ہم سوچتے ہیں کہ ابھی تو کاروانِ انسانیت کو اس مردِ راہ داں کی بہت ضرورت تھی، وہ جن کو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم مفکرِ قرآن ہونے کا منصب عطا کر رکھا تھا۔ جن کے مسلسل درس ہائے قرآنی سے ہم رہنمائی حاصل کرتے رہے۔ وہ اتنی گرانبہا نعمت ہم سے کیوں چھن گئی؟ یوں ممکن ہے (اپنی دانست میں) ایسا سوچنے میں ہم سچے ہوں لیکن اس کی بجائے ہم یوں بھی تو سوچ سکتے ہیں کہ باباجیؒ کی طبعی عمر نے ایک دن اختتام پذیر ہونا تھا، سو وہ ختم ہوگئی۔ مگر ان کی زندگی پر تو کوئی آنچ نہیں آئی۔ جیسا کہ ہم متعلمانِ قرآن پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ جسم کی موت سے نشوونما یافتہ "انسانی ذات" پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ انسانی سطح پر بسر ہونے والی زندگی، موت کی گرفت میں نہیں آتی بلکہ وہ تو اس جسدِ خاکی سے الگ ہو کر اسی طرح زندہ و سلامت اسفرِ آخرت پر روانہ ہو جاتی ہے، تو پھر ہمیں اپنے باباجیؒ کے جسمانی وجود کے نہ رہنے کا غم کیوں ہو؟ ہم جانتے ہیں کہ باباجیؒ نے اپنی عمر کے محدود وقت میں اپنے تفکر و تدبر اور بصیرتِ قرآنی سے قرآنِ کریم کی ابدی حقیقتوں اور دائمی صداقتوں کو ہم سب پر اس طرح منکشف کیا کہ ہمارے قلوب و اذہان کی تاریکیاں چھٹ گئیں۔ اور ہم پر روشنی کے در وا ہو گئے۔ یوں ان کی زندگی نے جو بیش بہا کام کیا۔ اس کی بدولت ان کی زندگی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے زیر کرتی ہوئی اخروی منزل کی جانب رواں دواں ہوگئی۔ یہی تو مقصودِ حیاتِ انسانی ہے۔ باباجیؒ اپنے مفوضہ فرائض پورے کر کے ہم سے رخصت ہو گئے۔ اور ہم سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ اس مفکرِ قرآن نے قرآن کے حقیقی مفہوم پر وضعی روایات کے تنے ہوئے پردوں کو چاک کرنے میں کس طرح اپنا سانس سانس وقف

رکھا اور کیا کردار انجام دیا۔ حق کی اس راہ میں باطل کی قوتیں بے پناہ مخالفتوں کا انہیں سامنا رہا اور بہت سی آزمائشیں اس مردِ مومن نے برداشت کیں۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مگر ان سب رکاوٹوں اور صعوبتوں کے ہوتے ان کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ انسانیت کو قرآن کی طرف لانے کا مشن برابر جاری رہا اور وہ اللہ کی آخری کتاب کو اس کے فرمان کے مطابق زندگی کا رہبر بنائے رہے۔ باباجیؒ نے قرآن کے ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت پر عمیق غور و فکر کیا اور مسلسل کرتے رہے۔ یوں بتوفیقِ ایزدی اس کتابِ مبین کو خود سمجھا، دوسروں کو سمجھایا اور انہیں خود غور و فکر کرنے کا راستہ دکھایا۔ یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارے کن اعمال کی جزا میں ہمیں ایسے معلمِ مشفق کی رہبری نصیب ہوئی۔ لیکن اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں کہ اسی رہبری سے ہم نے قرآن کا وہ مقام پہچانا جو خالقِ حقیقی نے اسے دیا ہے۔ اسی سے ہم یہ بھی جان سکے کہ قرآن اور انسان کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اسے ضابطۂ حیاتِ انسانی کیوں بنایا گیا ہے؟ قرآن ہم سے کیا تقاضا کرتا ہے اور وہ ہمیں کیا بنانا چاہتا ہے؟ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد اگلا سوال لازماً یہی پیدا ہوتا ہے کہ اس تعلیم و تحصیل سے ہم پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوئیں! اس مشنِ قرآنی کو جاری و ساری رکھنے میں ہم کتنا آگے بڑھے؟ اس قندیلِ نورانی کی روشنی سے معاشرے میں پھیلے ہوئے اندھیروں کو دور کرنے کی کتنی سعی کی؟ قانونِ خداوندی کے مطابق ہم نے اپنی اپنی ذات سمیت کتنے لوگوں کے اذہان و قلوب کی تطہیر کرنے کا اپنا فرض ادا کیا؟ کتنے مردوں عورتوں کو اپنی عملی زندگی میں قرآنی اقدار اختیار کرنے کی ترغیب دے سکے؟ افراد و معاشرہ کو بنیادی قدر احترامِ انسانیت کا حامل بنانے میں ہم نے کیا تعاون کیا؟ معاشرے میں عملی طور پر کس قدر صداقت و دیانت کو پھیلایا؟ جذبۂ اخوت کے تحت کتنے ایک دوسرے کے قریب تر ہوئے؟ کتنے اجنبیوں کو اپنائیت کا احساس دلایا؟ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو کر کہاں تک انسانیت کا حق ادا کیا؟ ظاہر بات ہے کہ قرآن کریم کو ضابطۂ حیات تسلیم کرتے ہوئے یہ اور اس قسم کی تمام دیگر ذمہ داریوں کی ادائیگی ہم پر لازم آتی ہے۔ کیا ہم اس اہم ترین معاملے میں سنجیدہ ہیں؟ یہ وہ اہم سوالات ہیں جن کے جواب بلاشبہ ہمیں اثبات میں دینے چاہییں۔ اس لئے کہ ہم نے باباجیؒ کے بعد ان کی پہلی اور پھر دوسری برسی پر اپنا احتساب کرتے ہوئے یہ عزم اور عہد کیا تھا کہ ہم ان سے حاصل کی ہوئی قرآنی تعلیم کا حق ادا کریں گے۔ فرداً فرداً بھی اس مشن کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہیں گے اور اجتماعی طور پر بھی ہمارا کام جاری رہے گا۔ اس عظیم مشن کی ذمہ داری قبول کئے اب تین سال گزر گئے ہیں اب ہمیں اس سعی و عمل کا تجزیہ کرنا ہے جو ہم باباجیؒ کی سرپرستی میں اور ان کے اٹھ جانے کے بعد ان گزرے سالوں میں کرتے رہے۔ یقیناً ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہے۔ فکرِ انسانی کو عام کرنے اور تعلیمِ قرآنی کو دلوں میں جاگزیں کرنے، اس کے مطابق نظامِ معاشرہ قائم کرنے کی تڑپ ہر متعلقہ فرد رکھتا ہے۔ اسی بنیاد

پراس نے اپنا کردار انجام دیا ہے اور ہم قرآنی بہن بھائی حسب توفیق اس نصب العین حیات کی بار آوری کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ہم کوتاہ قدم ضرور ہیں، لیکن اپنی منزل سے غافل نہیں۔ غافل کیسے ہو سکتے ہیں اور کیوں ہوں؟ ہمارے زندہ جاوید باباجیؒ ہمیں سالہا سال ہفتہ وار درس قرآن دیتے رہے ہیں۔ ہم میں سے جو سامعین ان عدیم النظیر درسوں کو اپنے کانوں کے راستے دلوں میں اتارتے رہے اور ذہنوں کو نکھارتے رہے، ان کے لئے کسی ایک درس سے بھی غیر حاضر رہنا ممکن نہ ہوتا تھا۔ اور یہ اس لئے کہ قرآن کریم کی آیات بیّنات کا اصلی اور حقیقی مفہوم خدا کے فرمان کے مطابق تصریف آیات سے سمجھا ہوا، اس سے قبل دین کی طلب رکھنے والوں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ جب اس کتاب حیات کے عطا کردہ اصول و ضوابط اور اقدار و قوانین اپنی اصلی شکل میں ہم پر واضح ہو گئے اور ہم نے فکر و فہم کے ساتھ انہیں قبول کر لیا اور ان کے لئے دل کی پوری رضامندی کے ساتھ اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہہ دیا۔ تو پھر ان سے عملاً وابستہ نہ رہنا تو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور ہمیں تو یہ خوش بختی بھی حاصل ہے کہ باباجیؒ کے دیئے ہوئے درسوں کا ہفتہ واری سلسلہ بدستور قائم ہے۔ یوں قرآن کی بات سمجھنے کے وہی مواقع ہمیں اب بھی حاصل ہیں۔ اور غور و خوض کرنے پر مزید حقائق و معارف سے ہماری شناسائی ہوتی ہے اور ترجمان حقیقت کے تفکر کی یہ صداقت ہم پر وا ہوتی ہے کہ ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید   کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

اس نہج پر سوچتے ہوئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اسے محض اپنے ذہن کے دریچوں میں سجائے اور قلب کی گہرائیوں میں بسائے مطمئن ہو جائیں یا یہ سمجھ لیں کہ بس ہم پر صراط مستقیم کی نشان دہی ہو گئی، ہم نے اسے جان لیا اور ہمارے کرنے کا کام ختم ہو گا۔ جبکہ یہیں سے تو ہمارے علم نے عمل صالح میں منتقل ہونا ہے۔ یہیں سے تو ہمارے کام کا آغاز ہوتا ہے۔ اور ہم نے ایک دوسرے کے تعاون، ایک دوسرے کی مشاورت و رفاقت سے خود بھی آگے بڑھنا ہے اور جو لوگ نہیں جانتے انہیں بھی بتانا ہے۔ قرآن کریم جو ضابطۂ حیات انسانی ہے، مکمل، محفوظ اور غیر متبدل۔ اسی کی طرف انسانیت کا رُخ پھیرنا ہے۔ جب ہم قرآن پر ایمان لانے کا اعلان کرتے ہیں۔ اور قرآن ہی کی زبان کے مطابق ہمیں اس کا قاری ہونے کی سعادت حاصل ہوتی ہے تو اول و آخر ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ ہم اس کے اٹل پیغام، اسکی دائمی تعلیم کو معاشرے میں عام کریں۔ صرف علم کی حد تک نہیں کہ اس کی حیثیت وعظ سے زیادہ نہیں ہوتی اور عمل کے بغیر علم کبر و نخوت میں بدل جاتا ہے۔ یقیناً خدا کا منشا ہی الدین قرآن کریم علم اور عمل کے بغیر نصب العین حیات اور مقصود انسانیت نہیں بن سکتا۔

ان حقائق کی روشنی میں احتساب خویش کے اس موقع پر لاریب ہم خود سے مایوس نہیں ہیں۔ ان تمیں سالوں میں الحمدللہ ہمارے قدم پیچھے نہیں ہٹے۔ حتی الامکان ہمارا کام آگے بڑھ رہا ہے۔

ادارہ طلوعِ اسلام کو مزید استحکام حاصل ہوا ہے۔ محترم باباجیؒ کی فکرِ قرآنی کو استمرار و دوام سے ہمکنار کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ دروسِ قرآنی کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ دین سے سچی لگن رکھنے والے ان درسوں میں اب بھی برابر آتے ہیں۔ کہ یہ وہ درس ہیں جن کو جتنی دفعہ بھی سنا جائے۔ فکر و سوچ کی نئی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ باباجیؒ اپنی بصیرتِ فرقانی کا جو بیش بہا خزینہ اپنی زندہ جاوید تصانیف کی شکل میں اس ملتِ اسلامیہ کے لئے، بلکہ پوری انسانیت کے لئے چھوڑ گئے ہیں، ان کی اشاعت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان سے فیض اٹھانے والے بھی صرف اپنے وطنِ عزیز میں ہی نہیں دیارِ غیر میں بھی وافر تعداد میں موجود ہیں اور روز بروز ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس اہم ترین فرض کی ادائیگی مناسب منصوبہ بندی کے ساتھ ہو رہی ہے اور اللہ بزرگ و برتر کی رحمتِ بے پایاں کے سائے تلے ہوتی رہے گی۔ اگر ہم نے عزمِ کامل، عملِ پیہم اور یقینِ محکم کے ساتھ اور ایک دوسرے کو ساتھ رکھتے ہوئے اپنی پوری توجہ اس طرف مرکوز رکھی، تو ہمارے بظاہر سست قدم تیز سے تیز تر ہوتے جائیں گے اور ہم اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچیں گے۔ اور خدائے بزرگ و برتر کا یہ وعدہ یقیناً پورا ہو گا۔

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔

ضرورتِ رشتہ

قرآنی گھرانے کے ایک نوجوان کے لئے، جس نے ایم اے اسلامیات اور ڈپلومہ ان ہومیو پیتھک میڈیکل سائنس (DHMS) کیا ہے قرآنی گھرانے سے رشتہ درکار ہے۔ خواہش مند حضرات اس پتہ پر رجوع فرمائیں۔

"ڈ غ ف" معرفت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵- بی، گلبرگ ۲ - لاہور ۱۱

پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا (سینیٹ) میں شریعت بل کے محرک (مولانا) سمیع الحق کی شریعت بل پر خطاب کے دوران

اِفتراء پردازی اور کذب بیانی

دنیائے انسانیت میں عظیم ترین انقلاب برپا کرنے والی مقدس ہستی حضور نبی اکرمؐ سے جب آپؐ کے مخاطبین نے یہ سوال کیا کہ آپؐ جو کہہ رہے ہیں کہ آپؐ کو خدا نے نبوت عطا کی ہے اور آپؐ پر وحی نازل کی ہے تو آپؐ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے۔ تو آپؐ نے جواباً فرمایا۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۱۰/۱۶)

میں اس سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔ (کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں جھوٹا انسان ہوں یا سچا)۔ کیا تم ذرا بھی سوچ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔

تم ہی نے تو مجھے صادق اور امین کے خطابات دے رکھے ہیں۔ تو کیا ایسی صاف، شفاف، صداقت اور امانت کی حامل زندگی والا انسان یکایک جھوٹ بولنے لگ جائے گا۔ یہ ایک ایسا ثبوت اور ایسا معیار تھا کہ مخاطبین لاجواب ہو گئے۔

یہ تھا حضور نبی اکرمؐ کا زمانہ قبل از نبوت کا کردار۔

نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد کی زندگی کے متعلق تو قرآن کریم کی شہادت موجود ہے جس میں ذاتِ باری تعالیٰ آپؐ کو ان وجد آفریں الفاظ میں یاد فرماتے ہیں

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (۶۸/۴)

(اے رسول آپ مکارمِ اخلاق کی انتہائی بلندیوں پر سرفراز ہیں)

اور حضور نبی اکرمؐ کے نزدیک حسنِ اخلاق (اور بلندیٔ کیریکٹر) کا کیا مقام تھا، حضور کے اس قول سے ظاہر ہے آپ نے فرمایا۔

بعثت لاتمم حسن الاخلاق (مؤطا)

اب آپ دیکھئے کہ اس ذاتِ اقدس واعظمؐ سے نسبت رکھنے والے ہمارے زمانے کے شریعتِ نبویؐ کے [illegible] شریعت بل کے محرک (مولانا) سمیع الحق اس معیار پر کیسے اُترتے ہیں۔ (کیونکہ ظاہر ہے کہ جس قسم کا کسی [illegible] کا کردار ہوگا اس کی تمام زندگی اسی کے مظاہر کی پرتو ہوگی)۔ اور پھر فیصلہ کیجئے کہ اس قسم کا کردار رکھنے والوں

کے پیش کردہ شریعت بل کا جو حشر ہوا اور ہو رہا ہے۔ کیا وہ انہی کے کذب و افترا کا فطری نتیجہ نہیں۔

(مولانا سمیع الحق جو جمیعتہ علماء اسلام پاکستان کے جنرل سیکرٹری بھی ہیں، سینٹ کے رکن بھی ہیں، اس شریعت بل کے محرک ہیں۔ انہوں نے ١٥ مارچ ١٩٨٦ء کو سینٹ میں شریعت بل پر تقریر کرتے ہوئے "اجتہاد کے نام پر تحریف والی دعوے کے تحت مندرجہ ذیل بیان دیا۔

" یہاں ہمارے ایک بہت بڑے دانشور نے جو اب وفات پا چکے ہیں اور سنت کے منکر تھے اور اجتہاد کے بڑے علمبردار تھے۔ اس نے کہا۔ **یسئلونک عن المحیض۔ قل ھواذیً** اب یہ ظاہر بات ہے سب حضرات علماء و فضلاء ہیں، محیض سے کیا مراد ہے کہ ماہواری کے ایام میں جو تکلیف ہوتی ہے خواتین کو۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ حکم بیان کرتا ہے کہ اس حالت میں معاملات اور تعلق کیسا رہے گا۔ اللہ نے کہا کہ یہ بیماری کے ایام ہیں اس میں دور رہنا چاہیئے۔ مگر اس شخص نے یوں ترجمہ کیا کہ

یسئلونک عن المحیض کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں آپ سے پوچھتے ہیں کیونکہ بینکنگ سسٹم کی وجہ سے وہ ساری دولت جمع ہو جاتی ہے اور ارتکاز دولت ہوتا ہے اور محیض کا معنی جمع کرنے کی جگہ تو یہ بینکاری سسٹم اور سارا **قل ھواذیً** یہ لعنت ہے اور غلط ہے۔ اس کو ختم کرو اور کمیونزم کو اس ملک میں نافذ کردو۔ یہ غلام احمد پرویز تھا اس پر کئی صفحے سیاہ کئے ہیں۔ ان کی تفسیر میں اس کا ترجمہ یہی ہے۔

جناب چیئرمین میں اسی لئے کہا گیا ہے کہ ؎

دلے تاویل شاں در حیرت انداخت

خدا و جبرائیل و مصطفےٰ را " (ماہنامہ الحق، اپریل ١٩٨٦ء)

(١٣) محترم پرویز صاحب نے اپنی تفسیر (مطالب الفرقان جلد سوم، ایڈیشن اوّل، نومبر ١٩٧٩ء کے صـ ٢٧٠۔٣٠٣ پر اس آیہ کریمہ کا مندرجہ ذیل مفہوم دیا اور تفسیر بیان کی ہے:۔

" جنسی اختلاط

معاشرتی زندگی افزائش نسل کا ذریعہ ہوتی ہے جو نتیجہ ہوتی ہے میاں بیوی کے جنسی اختلاط کا۔ قرآن کریم نے اس بارے میں ہدایات دی ہیں۔ اس نے کہا ہے۔

ویسئلونک عن المحیض قل ھو اذی فاعتزلوا النساء فی المحیض

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۔ (۲/۲۲۲)

نکاح کے بعد مقاربت کا سوال آتا ہے۔ سو ایامِ حیض میں اس سے اجتناب کرنا چاہیے اس لئے کہ حیض، عورت کے لئے ایک قسم کی واماندگی کا موجب ہوتا ہے اور اس میں مجامعت نقصان کا باعث۔ لہٰذا ان ایام میں عورتوں سے الگ رہنا چاہیئے تاوقتیکہ وہ اس سے فارغ ہو جائیں۔ جب یہ عرصہ ختم ہو جائے، تو جس طرح خدا کے طبیعی قانونِ تولید کا اشارہ ہے۔ تم اس طرح ان سے مقاربت کر سکتے ہو۔

اگر تم اس سے پہلے ایسا نہیں کرتے تھے تو اب صحیح راستے کی طرف لوٹ آؤ۔ قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدہ لوگ وہی ہیں جو غلط راستے کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کر لیں اور ناخوش آیند امور سے دُور رہیں۔

ایامِ حیض کے علاوہ (طُہر کی حالت میں بھی) روزے کے دنوں میں مباشرت ممنوع ہے۔ اسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۔ (۲/۱۸۷)

یہ بھی سمجھ لو کہ روزہ دن ہی دن کا ہے، رات کے وقت نہ کھانے پینے کی ممانعت ہے نہ ہی بیویوں کی طرف رجوع کرنے کی — بیویوں سے جنسی اختلاط قربِ خداوندی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ (یہ بھی مسلکِ خانقاہیت کا پیدا کردہ تصور ہے) میاں بیوی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے اور ایسا قریبی رشتہ کہ ان کے درمیان کوئی تیسرا حائل نہیں ہو سکتا۔ اللہ جانتا ہے کہ نفسِ انسانی کے تقاضے کیا ہیں اور مسلکِ رہبانیت میں انسان کے دل میں کس کس قسم کے خیال پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ خود اپنے آپ سے خیانت کرتا رہتا ہے۔ (دیکھئے ۵۷/۲۷) لہٰذا خدا کا قانون اس بارے میں انسانوں کی خود ساختہ حدود سے آگے بڑھتا ہے، اور تمہارے دل میں جو وساوس پیدا ہو رہے تھے، ان سے درگزر کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ تم رات کے وقت منشائے خداوندی کے مطابق اپنی بیویوں کے پاس بھی جا سکتے ہو۔

اس کے بعد کہا، وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ ۔ (۲/۱۸۷) اعتکاف کی حالت میں بھی مباشرت ممنوع ہے۔ (روزے اور اعتکاف کے متعلق پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ دیکھئے عنوان صیام اور حج)۔

—(•)—

آیت (۲/۲۲۲) میں ایک اہم نکتہ وضاحت طلب ہے۔ اس میں کہا ہے کہ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ

[illegible]

حَیْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰہُ۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "جب وہ پاک ہو جائیں تو جاؤ ان کے پاس جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے"۔ لیکن قرآن کریم میں اس قسم کا حکم کہیں نہیں دیا گیا کہ مباشرت کیسے کرنی چاہیئے، اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر "مِنْ حَیْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰہُ" کا مطلب کیا ہے؟ امر کے متعلق جلد اول صد۲۱۳ زیر آیت (۲۸/۲) بتایا جا چکا ہے کہ اس کے بنیادی معنیٰ راستے کی نشاندہی کرنے (DIRECTIVE) یا ہدایات کے ہیں حکم کے معنوں میں یہ ثانیاً استعمال ہوتا ہے۔ طبیعی افعال کے متعلق خدا کی طرف سے رہنمائی جبلّی طور پر حیوانات کے اندر رکھ دی گئی ہے، یہی خدا کا امر ہے جو خود انسان کے اندر بھی موجود ہے۔ یہ تو وحی کی رُو سے ہدایت ہے جو خارج سے ملتی ہے۔ طبعی افعال کے متعلق جبلّت یا فطری صلاحیت "امر اللّٰہ" کا حکم رکھتی ہے۔ اس آیت میں دیکھئے حالتِ حیض میں مباشرت سے احتراز کے لیے وحی کے ذریعے حکم دیا گیا کیونکہ یہ چیز حیوانی جبلّت میں نہیں اور اس کے بعد معاشرتی طریق کے متعلق اتنا کہہ دیا کہ مِنْ حَیْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰہُ۔ یعنی خدا کی مقرر کردہ جبلّی ہدایت کے مطابق۔"

موصوف نے اپنے "مفہوم القرآن" میں اس آیہ جلیلہ کا صد۸۴ پر یہ مفہوم دیا ہے:۔

> " نکاح کے بعد مقاربت کا سوال آتا ہے۔ سو ایام حیض میں اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ حیض، عورت کے لئے ایک قسم کی واماندگی کا موجب ہوتا ہے اور اس میں مجامعت، نقصان کا باعث، لہٰذا ان ایام میں عورتوں سے الگ رہنا چاہیئے۔ تاوقتیکہ وہ اس سے فارغ نہ ہو جائیں جب یہ عرصہ ختم ہو جائے، تو جس طرح خدا کے طبیعی قانونِ تولید کا اشارہ ہے۔ تم اس طرح ان سے مقاربت کر سکتے ہو۔"

اُن کی تیسری مایہ ناز تصنیف "لغات القرآن"، جلد دوم صد۵۸۵ پر مادہ "ح ی ض" کے تحت مندرجہ ذیل معانی دیئے گئے ہیں:۔

ح ی ض

حَاضَ السَّیْلُ۔ سیلاب خوب بڑھ گیا اور اس کا پانی چڑھا اور بہہ نکلا۔ دراصل اس لفظ کے معنی بہنے اور جاری ہونے کے ہیں۔ حَاضَتِ الْمَرْأَۃُ۔ عورت کے ماہواری خون کا جاری ہونا۔

اَلْمَحِیْضُ (۲۲۲/۲) حیض کا جاری ہونا، حیض کا خون، حیض کے ایام یا موضع حیض (جہاں سے حیض کا خون برآمد ہوتا ہے)، لیکن یہ لفظ خود حیض کے لیے بھی آتا ہے (لین)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ [illegible] کے درخت سے جو سُرخ رنگ کا پانی نکلتا ہے، اس کے لیے حَاضَتِ السَّمُرَۃُ [illegible] بولتے ہیں اس کی تائید کی ہے۔ حَاضَتْ، تَحِیْضُ۔ حائضہ ہونا۔ [illegible]

[illegible]

کسی بیماری کی وجہ سے حیض نہیں آسکا۔"

مولانا موصوف کا یہ خطاب "الحق" اکوڑہ خٹک کے اپریل ۸۵ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ ہم نے "الحق" اکوڑہ خٹک کے ایڈیٹر صاحب کو لکھا کہ وہ ہمیں اپنے رسالہ کا اپریل ۸۵ء کا شمارہ ارسال کریں۔ لیکن کافی تاخیر کے بعد انہوں نے ہمیں اپنا وہ پمفلٹ بھیجا جو مولانا سمیع الحق کے اس خطاب پر مشتمل ہے۔

اس کے بعد ہم نے ایڈیٹر صاحب الحق کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

۱۷ر نومبر ۱۹۸۷ء

مکرم و محترم جناب ضیاء الدین قریشی صاحب!

السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۳۱/۱۰/۸۷ بمع پمفلٹ "شریعت بل کا مقدمہ" جو مولانا سمیع الحق صاحب کی اس تقریر پر مشتمل ہے جو انہوں نے ۱۵ر مارچ ۸۵ء کو سینٹ کے اجلاس میں کی تھی، ملا۔ شکریہ!

برادرِ مکرم! اس پمفلٹ کے صفحہ ۲۱ پر مولانا موصوف نے اجتہاد کے نام پر تحریف والحاد کے عنوان کے تحت یسئلونک عن المحیض۔ قل ھو اذی کی ایک تفسیر محترم غلام احمد پرویز مرحوم سے منسوب کی ہے جو ان الفاظ میں ہے۔

"ہمارے یہاں ایک بہت بڑے دانشور نے جواب وفات پا چکے ہیں..........

یہ غلام احمد پرویز تھا اس پر کئی صفحے سیاہ کئے ہیں۔ ان کی تفسیر میں اس کا ترجمہ یہی ہے۔"

ہم نے محترم غلام احمد پرویز مرحوم کی تفسیر "مطالب الفرقان" کو بنظرِ غائر دیکھا ہے اور ایسے ہی ان کی دیگر جملہ کتب کو بھی۔ مگر ہمیں مذکورہ بالا تفسیر نہیں ملی۔

اس وقت مولانا سمیع الحق صاحب ماشاء اللہ بقیدِ حیات ہیں اور اس پوزیشن میں کہ وہ مذکورہ تفسیر کی پرویز صاحب مرحوم کی کتب سے نشاندہی فرما سکیں۔ براہِ کرم جناب سمیع الحق صاحب سے درخواست کریں اگر آپ کو خود معلوم ہے۔ تو ہماری اطلاع کے لیے ایسی تفسیر کا حوالہ (نام کتاب، مضمون، تاریخ طبع و صفحہ نمبر) لکھ بھیجیں ہم شکر گزار ہوں گے۔

ہم آپ کی طرف سے جواب کا پندرہ یوم تک انتظار کریں گے۔ ورنہ ایوانِ بالا (سینٹ) اور ذرائع ابلاغِ عامہ کو اس امر کی یک طرفہ وضاحت کا ہمیں پورا پورا حق ہوگا۔

امید ہے آپ فوری توجہ فرمائیں گے۔

والسلام

پندرہ یوم گذرنے کے بعد تک ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا جس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں حق بجانب ہیں کہ (مولانا) سمیع الحق اپنی اس کذب بیانی کے جواز میں کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکتے۔

سینٹ، پاکستان کا اعلیٰ ترین قانون ساز ادارہ ہے۔ (مولانا) سمیع الحق اس کے رکن ہیں۔ سینٹ کے تمام اراکین کے سامنے، کسی عام دنیاوی معاملے میں نہیں بلکہ شریعت بل پر بحث کے دوران، (جس کے وہ خود محرک ہیں) ایسا سفید جھوٹ بولتے ہیں اور سینیٹ کے چیئرمین اس پر یہ شعر موزوں فرماتے ہیں :-

دے تاویلِ شاں در حیرت انداخت
خدا و جبرائیل و مصطفٰےؐ را

گویا وہ (مولانا) سمیع الحق کے اس انکشاف پر انہیں شاباش کہہ رہے ہیں، اور اراکین سینٹ میں سے کسی کو توفیق نہیں ہوتی کہ وہ (مولانا) سمیع الحق سے کہے کہ حضرت اس پلیٹ فارم سے ایسی غلط بات آپ کو زیب نہیں دیتی حالانکہ ہمارے علم کے مطابق سینٹ میں ایسے اراکین موجود تھے جو ذاتی طور پر جانتے تھے کہ پرویزؒ صاحب کی طرف اس تفسیر کی نسبت سراسر دروغ گوئی ہے۔

ہم حکومتِ پاکستان سے گذارش کریں گے کہ وہ (مولانا) سمیع الحق اور چیئرمین سینٹ سے محولہ بالا تفسیر کا ثبوت طلب کرے اور اگر وہ ثبوت مہیا نہ کر سکیں (اور وہ یقیناً ایسا نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ پرویزؒ صاحب خدا کی کتابِ عظیم کے ساتھ ایسے مذاق کا کبھی تصور بھی نہ کر سکتے تھے) تو ان دونوں اصحاب سے نہ صرف یہ کہا جائے کہ سینٹ کے آئندہ اجلاس میں اپنے اس بہتان اور کذب کا اعتراف کر کے اراکین سینٹ سے معافی طلب کریں بلکہ ان کے خلاف سخت تادیبی کارروائی بھی کی جائے۔ کہ انہوں نے سینٹ کے اعلیٰ ترین مقام سے ایسا بے بنیاد جھوٹ بولا ہے۔

اب تک تو، یہ بات تعلیماتِ مودودی مرحوم ہی میں تھی کہ

"راستبازی و صداقت شعاری، اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ بعض حالات میں وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔"

بحوالہ ترجمان القرآن، مئی ۱۹۵۸ء، صہ ۵۳

لیکن اب معلوم ہوا کہ جمیعۃ العلماء اسلام (پاکستان) کے اکابرین کا بھی یہی عقیدہ اور طرزِ عمل ہے۔ نہ معلوم (مولانا) سمیع الحق کو عملی زندگی کی وہ کون سی ضرورت پیش آگئی جس کے تحت انہوں نے یہ جھوٹ بولنا واجب سمجھا!

ہم نہیں سمجھتے کہ شریعت اور شریعت بل کے نام پر اس قسم کے گھناؤنے کھیل کھیلنے والوں کے ہاتھ [illegible]

[illegible]

ایک چراغ اور لاکھ اندھیرے!

(بتقریب یوم پیدائش قائداعظمؒ۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۷۱ء بعد دوپہر، بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے زیرِ اہتمام وائی۔ایم۔سی۔اے۔ ہال لاہور میں جلسہ عام منعقد ہوا جس میں پرویز صاحب نے عنوانِ بالا پر سامعین سے خطاب کیا۔ تقریر ٹیپ پر ریکارڈ کر لی گئی تھی۔ اس کے بعد اسے ٹیپ سے از سرِ نو مرتب کر کے شائع کیا گیا۔)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

صدرِ محترم! میری عزیز بہنو اور بھائیو! اسلام و رحمت۔

قرآن نے ایک جگہ کہا ہے کہ عَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ (۲/۲۱۶) ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار گزرے لیکن اس میں تمہارے لئے خیر کے پہلو مضمر ہوں۔ قرآنِ کریم نے یہ بات جنگ کے سلسلہ میں کہی تھی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کی محسوس تفسیر بھی ہمارے سامنے حالیہ جنگ[1] کے وقت آئی۔ ہماری نئی نسل کے جو بچے تقسیم کے بعد پیدا ہوئے یا جن کے شعور نے پاکستان میں آکر آنکھ کھولی، وہ بار بار اعتراض کیا کرتے تھے کہ مسلمانوں نے پاکستان کیوں بنا لیا۔ یہ ہندوستان سے الگ کیوں ہو گئے۔ وہ اتنا وسیع و عریض ملک تھا۔ اُس کے وسائل کثیر تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک اس ملک کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے پر مجبور تھے۔ اگر ہم ان کے ساتھ رہتے تو ہمیں یہ آئے دن کی مصیبتیں کیوں بھگتنی پڑتیں۔ یہ تکلیفیں کیوں اٹھانی پڑتیں۔ یہ دشواریاں کیوں پیش آتیں، ہم نے ان سے الگ ہو کر خواہ مخواہ اپنے لئے پریشانیاں پیدا کر لیں۔ مفت میں ایسا تکلیف دہ دردِ سر خرید لیا۔ اگر ہم ان کے ساتھ رہتے تو نہ پانیوں کا سوال پیدا ہوتا اور نہ کشمیر کا مسئلہ ہمارے لئے سوہانِ روح ہوتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

نوجوانوں کے اعتراضات

یہ نوجوان کثر میرے پاس آتے، میں پہلے انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ آزاد مملکت کا وجود ہمارے دین کا تقاضا، اور ایمان کا مطالبہ تھا، ہم غیروں کی محکومی میں اسلامی زندگی بسر کر ہی نہیں سکتے۔ اسلام ایک نظامِ حیات، ایک ضابطۂ زندگی ہے۔ جو اپنے متشکل ہونے کے لئے ایک آزاد خطۂ زمین چاہتا ہے۔ یہ تھی

---

[1] ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ۔ [2] مارچ ۱۹۴۰ء۔

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد۔ لیکن اسلام کے متعلق جو کچھ وہ مسجدوں اور وعظوں میں سنتے، حتےٰ کہ جو کچھ انہیں
دینیات کے نام سے پڑھایا جاتا، اس کی روشنی میں میری بات ان کی سمجھ میں نہ آئی — یہ بات ہمارے ہاں کے
جلسے بیشتر جمہوروں کی سمجھ میں نہیں آتی، ان بچوں کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کا کیا گلہ! بگلہ تو اس بات کا ہے کہ
انہیں پاکستان میں بھی صحیح اسلام سے روشناس نہیں کرایا گیا۔ اگر ان کی تعلیم کی عمارت صحیح بنیادوں پر اٹھتی تو پھر یہ
سمجھتے کہ دین اور مذہب میں فرق کیا ہوتا ہے۔ مذہب ہر فضا میں پنپ سکتا ہے۔ بلکہ محکومی اور بیچارگی میں وہ
اور گہرا اور شدید ہو جاتا ہے اور دین آزاد مملکت کے علاوہ اور کہیں سانس نہیں لے سکتا۔

یہاں سے نیچے اتر کر جب ان نوجوانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ ہندو ایسی قوم ہے ہی نہیں جس
کے ساتھ کوئی شریف آدمی زندگی بسر کر سکے تو یہ بات پھر اُن کی سمجھ میں نہ آئی۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے ہندو کو دیکھا
ہی نہیں تھا۔ ان کا اس کے ساتھ کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ہمارے یہ نوجوان کہتے تھے کہ دنیا میں اور ملک بھی ہیں،

ہندو کیا ہے؟

جن میں مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے لوگ ایک جگہ آرام سے رہتے سہتے ہیں۔ ہم
ہندوؤں کے ساتھ اسی طرح کیوں نہیں رہ سکتے تھے۔ اس جنگ میں ہندو جو بے نقاب
ہو کر سامنے آیا، تو ہمارے ان نوجوانوں نے پہلی مرتبہ اسے اس کے اصلی خدوخال میں دیکھا اور اس کے بعد
خود بخود بغیر کچھ سمجھے سمجھانے کے پکار اٹھے کہ آپ سچ کہتے تھے۔ اس قسم کے انسانوں کے ساتھ کوئی شریف آدمی
نہیں رہ سکتا۔ غالب نے ایک جگہ کہا ہے۔

فغانِ من دلِ خلق آب کرد ورنہ ہنوز
نگفتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد

حقیقت یہ ہے کہ قائداعظمؒ کی صحیح عظمت بھی اسی وقت سامنے آتی ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ ان کا
واسطہ کس قسم کے لوگوں سے پڑا تھا اور کس کس ذہنیت کے دشمنوں سے جنگ کر کے انہوں نے پاکستان
حاصل کیا تھا — ان مخالفوں میں ایک طرف ہندو تھا جو اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام مسلمانوں کو اپنا محکوم رکھ
کر لینا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ دوسری طرف انگریز تھا۔ جس کے سینے میں صلیبی جنگوں کے زخم ابھی تک مندمل نہیں
ہوئے — یا یوں کہیے کہ اس نے انہیں ابھی مندمل نہیں ہونے دیا۔ اور وہ اس موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ مسلمانوں
کو کس طرح نقصان پہنچایا جائے۔ ان دونوں مخالفوں کا متحدہ محاذ بھی کچھ کم جرأت آزما اور حوصلہ فرسا نہ تھا جو ان کے
ساتھ، خود مسلمانوں کی کئی ایک جماعتیں بھی "شریکِ جہاد" ہو گئیں — نیشنلسٹ مسلمان، جمعیت العلماء، مجلس
احرار، سرخپوش، انصار، جماعتِ اسلامی، سب تحریکِ پاکستان کے مخالفوں کی صفوں میں شامل تھے اور
ان کے مقابلہ اسلام کا یہ سپاہی (قائداعظمؒ) تنہا کر رہا تھا۔

حالیہ جنگ کی علت

ہندوستان اور پاکستان میں جو حالیہ جنگ ہوئی ہے، اس کی علت مسئلہ کشمیر کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس مسئلہ کو ہندوستان اور پاکستان کی نزاع میں بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن یہ بھی علاماتِ مرض میں سے ایک علامت ہی ہے علتِ مرض کچھ اور ہے۔ قرآن کریم نے اسلام کے دشمنوں کے متعلق کہا ہے۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ (۳/۱۱۷) اسلام دشمنی کی کچھ باتیں بعض اوقات ان کی زبان سے دبے اختیار نکل جاتی ہیں۔ ورنہ جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہے، وہ ان سے کہیں زیادہ شدید ہے اسی قسم کی ایک بات اگلے دنوں، ہندوستان کے وزیر دفاع مسٹر چوہان کی زبان سے بھی بے اختیار نکل گئی۔ اسے غور سے سنئے۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ:-

> پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں، اور یہ اختلاف اور دشمنی ہفتے یا مہینے بھر کی نہیں، بلکہ سالہا سال تک رہے گی بھارت کو اس کیلئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔

اس سلسلے میں مسٹر مہاجن نے اگلے دنوں اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں بھارت کے نیتاؤں (سربراہوں) کی ایک خفیہ مجلس میں یہ تجویز زیرِ غور آئی تھی کہ پاکستان پر فوراً حملہ کر دیا جائے مسٹر مہاجن کو افسوس تھا کہ اس تجویز پر اس وقت عمل نہ کیا گیا۔ اور پاکستان کو موقعہ دے دیا گیا، کہ وہ اپنی مدافعت کی تیاریاں کر لے، ورنہ معاملہ اسی وقت صاف ہو جاتا۔

یہ تھے برادرانِ عزیز! ان قوموں کے عزائم، اور یہ ہے اس جنگ کی بنیادی وجہ۔ یعنی یہ کوئی ہنگامی اختلاف اور عارضی نزاع نہیں۔ یہ وہی کفر و اسلام کی نزاع ہے جو پہلے دن سے چلی آرہی ہے۔ یہ وہی حق و باطل کی کشمکش ہے جو "ازل سے تا امروز" مسلسل جاری ہے اور جاری رہے گی۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی، وہی مرحبی وہی عنتری

ہندی جمہوریت

انگریز ہندوستان سے جا رہا تھا۔ ہندو کا مطالبہ یہ تھا کہ ملک کا اقتدار "اہل ملک" کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ وہاں جمہوری انداز کی حکومت قائم کر سکیں سطحی طور پر آپ دیکھیں تو یہ مطالبہ بڑا معقول اور یہ روش بڑی انصاف پسندانہ نظر آئے گی۔ لیکن اگر آپ سطح سے ذرا نیچے اتر کر دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ جمہوریت کے اس معصوم سے جال میں کس قدر "مسلم شکاری" کا ... جمہوریت ...

دنیا میں جہاں جہاں نظامِ جمہوریت رائج ہے، وہاں بالعموم کیفیت یہ ہے کہ سارے ملک میں ایک قوم بستی ہے۔ قوم میں مختلف سیاسی پارٹیاں ہیں۔ الیکشن میں ایک پارٹی اکثریت حاصل کر لیتی ہے اور زمامِ اقتدار اس کے [ہاتھ] آجاتی ہے۔ جو پارٹی اقلیت میں رہ جاتی ہے، وہ کوشش کرتی ہے کہ مخالف پارٹی کے کچھ ممبروں کو توڑ کر اپنے ساتھ ملالے۔ اور یوں اپنی اقلیت کو اکثریت میں بدل کر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اگر وہ اس طرح کامیاب نہ ہو تو آئیندہ الیکشن تک کا انتظار کرتی ہے تاکہ اس وقت اکثریت حاصل کر لے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس انداز میں کوئی پارٹی مستقل طور پر برسرِ اقتدار اور دوسری پارٹی ابدی طور پر محکوم نہیں رہتی۔ اس میں ادل بدل اور اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں صورتِ حالات اس سے یکسر مختلف تھی۔ اس میں ہندو اکثریت میں تھے اور مسلمان اقلیت میں۔ اور ان کی اقلیت کبھی اکثریت میں تبدیل نہیں ہو سکتی تھی۔ تا وقتیکہ یہ وہاں کے دس پندرہ کروڑ ہندوؤں کو مسلمان نہ کر لیں، جو ناممکن تھا۔ لہٰذا ہندوستان کی جمہوری حکومت درحقیقت ہندوؤں کی حکومت اور مسلمانوں کی ابدی محکومی کے مترادف تھی۔ اس سلسلہ میں ہندوؤں کے عزائم کیا تھے۔ اس کا انکشاف قائدِ اعظمؒ نے آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۴۳ء میں، ان الفاظ میں فرمایا تھا

> ساورکر (صدر مہاسبھا) کی اسکیم یہ ہے کہ جب (انگریز) کے چلے جانے کے بعد میدانی، بحری اور فضائی فوج اور نظم و نسق میں ہندوؤں کو ۷۵ فیصد حصہ مل جائے گا، تو پھر ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں بستے ہیں؟ سنیئے وہ (مسٹر ساورکر) کہتے ہیں کہ سرحدوں پر ہندو فوج اس طرح بٹھا دی جائے گی جس طرح اب برطانوی فوج متعین ہے۔ اور یہ فوج اس کا خیال رکھے گی کہ مسلمان سر نہ اٹھا سکیں۔

آپ نے اندازہ لگایا، عزیزانِ من! کہ جمہوری اندازِ حکومت کے ماتحت، ہندوؤں کے عزائم کیا تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہندوؤں کی متشدد مذہبی جماعت تھی۔ ان کا نیشنلسٹ طبقہ جو کانگریس سے متعلق تھا، وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ ان کے پیشِ نظر سیکولر اسٹیٹ کا تصور تھا جس میں کسی خاص گروہ کے مذہبی تعصبات کا دوسرے گروہ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔ لیکن ایسا کہنے والوں کو اس کا علم نہیں کہ وہاں خود کانگریس کے کیا عزائم تھے۔ اگست ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے۔ کانگریس کے جنرل سیکرٹری اچاریہ کرپلانی نے ایک طویل بیان شائع کیا تھا جس میں اس امر کی وضاحت کی گئی تھی کہ کانگریس کے سامنے صرف ملک کے سیاسی مقاصد نہیں، وہ ملک کی معاشرتی زندگی کو گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کے مطابق، از سر نو متشکل کرنا چاہتی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا تھا۔

کانگریس کے عزائم

کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کو ...

چھین کر اہل ملک کے ہاتھ میں دیدیں۔ بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق، اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظِ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متأثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے ہندوستان میں لانا چاہتے تھے۔

یہ تھے برادرانِ عزیز! اس کانگریس کے عزائم جسے یکسر سیکولر پارٹی سمجھا جاتا ہے ـــــ یہ گاندھی جی، جن کے فلسفۂ حیات کو ملک کی نئی معاشرتی زندگی کا سنگِ بنیاد بنانا مقصود تھا، خود کیا تھے، اس کے متعلق انہی کی زبان سے سنیئے۔ انہوں نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" کی ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔

میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں۔ کیونکہ میں ویدوں، اُپ نشدوں، پرانوں، اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں، اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گئورکشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا ذرہ ذرہ ہندو ہے۔

منافقت

جنگ کے دوران، آپ نے ہندوستان کے وزیراعظم مسٹر شاستری کی قلابازیوں کا تماشہ دیکھا ہوگا۔ (یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے)۔ ـــ جو کچھ صبح کے وقت کہا اس کی تردید دوپہر کو کردی۔ جو کچھ دوپہر کو کہا، اس سے شام کو مکر گئے۔ الفاظ ہمیشہ ذو معنی استعمال کئے۔ آج ان کا مطلب کچھ لیا، کل کچھ اور ـــ دھوکا، فریب، غلط بیانیاں، یہ ان کا معمول ہے۔ جو کچھ خود کیا یا کرنا چاہا پہلے اس کا الزام پاکستان کے سر دھر دیا، جانا کسی اور طرف کو ہوا، رُخ کسی اور طرف کا کیا۔ بتایا کچھ اور کیا کچھ اور ـــ یہ ہے ان کی سیاست۔ لیکن یہ روش مسٹر شاستری کی طبع زاد نہیں، اسے بھی انہوں نے اپنے بزرگوں سے ورثہ میں پایا ہے۔ "مہاتما" گاندھی بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ ان کے متعلق قائداعظمؒ نے (مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، جالندھر کے اجلاس ۱۹۴۲ء میں) کہا تھا۔

ان کا (گاندھی جی کا) مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں۔ اور جو ان کا مقصد ہوتا ہے وہ کہتے نہیں۔

اسی طرح انہوں نے اگست ۱۹۴۵ء میں ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمیں جس حلیف سے پالا پڑا

سے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔

جب ان کے (مسٹر گاندھی کے) مفید مطلب ہوتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں۔ وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے چار آنہ کے ممبر بھی نہیں رہتے۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن بھرت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل پاس نہیں رہتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں کہئیے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں؟ وہ تو ایک چیستان ہیں، ایک معمہ ہیں۔

اُن کی دو رُخی کا عالم یہ تھا کہ جنگِ عظیم کے دوران جب انگلستان پر دن رات بمباری ہو رہی تھی اور جاپانی کلکتہ تک بڑھ آئے تھے، وہ وائسرائے کے ہاں گئے اور کہا کہ جب میں لنڈن پر بمباری کی خبریں پڑھتا ہوں اور وہاں کے جوانوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں پر جو کچھ گذرتی ہے، اسے سنتا ہوں، تو میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ایسے نازک حالات میں، میں انگریزوں کے لئے ہندوستان میں کسی پریشانی کا موجب نہیں بننا چاہتا۔ میں تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر جنگ کے سلسلہ میں، بلا مشروط تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وائسرائے بہت متأثر ہوئے۔ ان کی ہمدردی اور تعاون کا شکریہ ادا کیا۔

گاندھی جی نے ادھر یہ کیا اور ادھر کانگریس کی مجلس عاملہ سے ریزولیوشن پاس کرا دیا کہ اگر حکومت ملک کے اختیارات، کانگریس کی طرف منتقل کرنے کا وعدہ نہیں کرتی تو ہم ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے۔ یہاں کے نظم و نسق کو تہ و بالا کر دیں گے۔ انگریزوں کو یہاں سے نکال کر دم لیں گے۔

اور جب وائسرائے نے گاندھی جی سے پوچھا کہ یہ کیا؟ تو انہوں نے نہایت معصومانہ انداز میں کہہ دیا کہ میرا کانگریس پر کیا بس ہے۔ میں تو کانگریس کا چار آنہ کا ممبر بھی نہیں ہوں۔

آپ سوچئے برادرانِ عزیز! کہ جس قوم کے "مہاتماؤں" کا یہ عالم ہو، اس کے "مسٹروں" کی کیا کیفیت ہو گی! اس سلسلہ میں مجھے حال ہی کی ایک دلچسپ بات یاد آ گئی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جوڑیاں کے معرکے کے ضمن

جوڑیاں کی مسجد

میں، آل انڈیا ریڈیو نے یہ خبر نشر کی تھی کہ پاکستانی بمباروں نے صبح کے آٹھ بجے جوڑیاں کی مسجد پر بم گرائے اور پچاس نمازیوں کو شہید کر دیا اور اس کے بعد واویلا مچایا تھا کہ ان لوگوں کو دیکھو! یہ اپنی پرستش گاہوں کو بھی تباہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ اوّل تو آپ دیکھئے کہ صبح کے آٹھ بجے کون سی نماز ہوتی ہے جس میں پچاس نمازی شہید ہو گئے [illegible]

غور کیجئے کہ میں جوڑیاں کی مسجد میں گیا ہوں۔ وہ اتنی چھوٹی ہے کہ اس میں پچاس آدمی بیک وقت بمشکل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ وہاں ہمیں بتایا گیا کہ جب جوڑیاں پر پاکستانیوں نے قبضہ کیا ہے تو یہ مسجد نہایت خستہ اور خراب حالت میں تھی کہ اس میں ایک موچی بیٹھتا تھا۔ اسے مسجد کی شکل دوبارہ ہماری فوج کے سپاہیوں نے دی ہے۔

اور آگے بڑھیئے۔ اس مسجد پر (افسانوی) بمباری کی خبر نشر کر کے، بھارتیوں نے یہ تاثر بھی پیدا کرنا چاہا کہ انہیں دوسرے مذاہب کی پرستش گاہوں کا بڑا احترام ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی مساجد کی حالت کیا ہے۔ یہ میرے سامنے ہندوستان کے

ہندوستان کی مساجد

اخبار مدینہ کی ۲۸ جولائی ۱۹۶۵ء کا پرچہ ہے۔ اس میں لدھیانہ سے شائع ہونے والے (ہندوؤں کے ایک اخبار) ترجمان کے حوالے سے دلچسپ خبر درج ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک مسجد پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ اس کے ایک کمرے پر ایک سکھ نے قبضہ جما لیا۔ ہندوؤں نے اسے بے دخل کرنا چاہا تو اس نے مسلم اوقاف بورڈ سے کہہ کر ہندوؤں کے خلاف مقدمہ دائر کرا دیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار ترجمان نے کہا ہے کہ اس سکھ سردار کو ایسا کرتے وقت ذرا خیال نہ آیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ۔

اس شہر کی ۱۱۷ پرانی مسجدوں میں سے ۹۰ میں گوردوارے قائم ہیں اور صرف ۱۵، ۱۶ میں مندر باقیوں میں رہائش ہے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! ہندوستان کی سیکولر اسٹیٹ میں مسلمانوں کی مساجد کی حالت ــــ اُس سیکولر اسٹیٹ میں جس کے نمائندوں کو جوڑیاں کی مسجد کی "تباہی" سے اس قدر صدمہ ہوا ہے۔

برطانیہ اور پاکستان

یہ تو ہندو تھا ــــ اب اس محاذ کے دوسرے فریق "انگریز" کو لیجئے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ہندوؤں نے بڑی شدّ و مد سے پراپیگنڈا کر رکھا تھا کہ تقسیمِ ہند کی اسکیم انگریز کی پیدا کردہ ہے۔ اور جناحؒ، انگریز کے اشارے پر تشکیلِ پاکستان کی تحریک چلا رہا ہے ــــ ہندو تو ایک طرف، خود پاکستان میں ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جو اس خیال کو عام کرنے میں مصروف رہتے ہیں کہ پاکستان کا تصور برطانیہ کی پیدا کردہ سازش تھی ــــ اور قائداعظمؒ انگریز کا آلۂ کار تھا۔

لیکن سنیئے! کہ تحریکِ پاکستان کے دوران انگریز، مسلمان کے خلاف کیا کچھ کر رہا تھا۔ اور اس محاذ میں ہندو اور انگریز دونوں کس طرح مسلمانوں کے خلاف شانہ بہ شانہ لڑ رہے تھے۔ انگریز مسلمانوں کے خلاف کیا کچھ کر رہا تھا، اس کے متعلق قائداعظمؒ نے (سندھ مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنس میں، اکتوبر ۱۹۳۸ء میں

...ہندوستان کے مسلمانوں کو بھیڑیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ...ہو سے وہی بازی لے جا سکتا ہے جس میں قوت ہو لیکن ہم ہندو اور برطانیہ دونوں سے ...گے۔

...نے فروری ۱۹۴۳ء میں، لیگ کونسل کے اجلاس میں کہا تھا۔

...ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگریس، مسلمانوں پر حکومت ...چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے، نہ ہندو کو۔ ہم ...آزاد رہنا چاہتے ہیں۔

...۱۹۴۳ء میں مرکزی اسمبلی میں ایک ایسا بل پیش ہوا، جس سے مسلمانوں کے حقوق کی سخت پامالی ہوتی ...اس بل پر تقریر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا۔

میں انگریز اور ہندو، دونوں کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ تم الگ الگ یا دونوں متفق ہو کر بھی، ہماری روح کو فنا کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ نہ تم اس تہذیب کو مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ ہمارا نورِ ایمان زندہ ہے۔ زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔ تم ہم پر ظلم و ستم کرو، ہمارے ساتھ بدترین سلوک کرو۔ ہم ایک فیصلہ پر پہنچ چکے ہیں۔ اور ہم نے یہ عزم کر لیا ہے کہ ہم لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔

...ہوں نے ۱۹۴۴ء میں یوم پاکستان کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

اگر ہندو قیادت یا برطانوی قیادت الگ الگ یا دونوں متحد ہو کر ہمارے خلاف فریب کاریوں اور سازشوں پر اُتر آئیں تو ہم اس کی مدافعت کریں گے۔ تا آنکہ ہم ایک ایک کر کے مٹ کر مر جائیں۔

...ہوں نے ۱۹۴۵ء میں پشاور کے ایک جلسہ عام میں فرمایا۔

ہمارا کوئی دوست نہیں۔ ہمیں نہ انگریز پر بھروسہ ہے نہ ہندو پر۔ ہم دونوں کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے خواہ وہ آپس میں متحد بھی کیوں نہ ہو جائیں۔

...متحدہ سازش

اس زمانے میں چین میں جنرل چیانگ کائی شک برسرِ اقتدار تھے جن کے پنڈت جواہر لال نہرو سے بڑے گہرے مراسم تھے اور دوسری طرف ان کا امریکہ پر بھی ...تھا۔ ان سب کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے مسئلہ کو کسی طرح اقوامِ متحدہ میں لے جایا جائے۔ اس پر ...اعظمؒ نے نومبر ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

چین اور امریکہ کی متحدہ قوت بھی ہم پر کوئی ایسا دستور مسلط نہیں کر سکتی جس میں مسلمانوں...

کو قربان کر دیا گیا ہو۔ اگر متحدہ اقوام کسی ایسی مجنونانہ حرکت کا ارتکاب کر بیٹھی تو اسے معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اپنی حفاظت کے لیے ایک چیونٹی بھی پلٹ کر حملہ کر دیا کرتی ہے۔ ان غیر ملکی سنگینوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جن کے سائے میں کانگریس راج رچایا جا رہا ہوگا، ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دیں گے اور اسے معطل کر کے رکھ دیں گے۔

کیبنٹ مشن

۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن ہندوستان آیا۔ حکومتِ برطانیہ نے اعلان کیا کہ جو پارٹی اس مشن کی تجاویز کو قبول کرے گی اُسے تشکیلِ حکومت کا موقع دیا جائے گا۔ کانگریس نے اس مشن کی تجاویز کو نہ قبول کیا نہ مسترد۔ لیکن مسلم لیگ نے انہیں قبول کر لیا۔ اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ حکومتِ برطانیہ اپنے وعدہ سے صاف مُکر گئی۔ اور لیگ کو تشکیلِ حکومت کا موقع نہ دیا۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے (مسلم لیگ کونسل کے اجلاس لکھنؤ میں) کہا:۔

ہم بحث تمحیص کرتے تھک گئے ہیں۔ کسی سے مدد مانگنا بے سود ہے۔ دنیا میں کوئی بھی عدالت نہیں جس سے ہم داد خواہی کر سکیں۔ ہماری آخری عدالت ملتِ اسلامیہ ہے اور ہم اسی کے فیصلے کی پابندی کریں گے۔

پھر انہوں نے جولائی ۱۹۴۶ء میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

ہم جانتے ہیں کہ برطانیہ کے پاس مشین گنیں ہیں۔ وہ اپنی طاقت کو جس طرح چاہیں استعمال کریں دنیا کی کوئی عدالت نہیں جس کے پاس ہم اس کے خلاف اپیل کر سکیں گے۔ دوسری پارٹی کانگریس ہے۔ وہ پوری طرح دوسری قسم کے ہتھیاروں کو استعمال کرے گی۔ اس لئے اب ہم اپنے حفظ و بقا کے لیے آئینی طریقوں کو خدا حافظ کہنے پر مجبور ہیں اور اب ہم نے طے کر لیا ہے کہ ۔ راست اقدام کی تیاریاں اور عمل ہماری پالیسی اور پروگرام کا جزو ہوگا۔

اور اگست ۱۹۴۶ء میں بتقریبِ عید قوم سے کہا کہ:۔

مسلم ہندوستان کو برطانیہ کی بدعہدیوں اور وعدہ خلافیوں نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ہم نے اگست ۱۹۴۰ء کے اعلان کے مطابق ان سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ جب تک ہندوستان کی بڑی سیاسی جماعتوں اور قومی زندگی کے دوسرے اہم عناصر میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو جائے۔ حکومت کے اختیارات کسی ایک پارٹی کے نام منتقل نہیں کئے جائیں گے۔ اس اعلان میں یہ بھی تحریر ہے کہ جب تک ہندو مسلم سمجھوتہ نہ ہوگا، ہندوستان کے لئے کوئی نیا آئین مرتب نہیں ہوگا، لیکن آج حکومتِ برطانیہ اس صاف اور واضح اعلان کے پُرزے پرزے کر رہی ہے۔

تھا برادرانِ گرامی قدر! برطانیہ اور ہندو کا رویّہ ہمارے ساتھ اور قائدِ اعظمؒ کو ان دونوں سے برسرِ پیکار ہونا پڑتا تھا۔

جب ہندوؤں نے دیکھا کہ وہ مسلمانوں سے آئینی بازی نہیں لے جا سکتے تو وہ ان حربوں پر اُتر آئے جو

قتل و غارت گری

اس قسم کے دشمن کی دنایت کا آخری مظاہرہ ہوتا ہے۔ انہوں نے ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، فسادات برپا کرنے شروع کر دیئے اور اس طرح مسلمانوں کے جان، مال، عزّت، آبرو کو تباہ کرنے لگے۔ پہلے بمبئی میں فسادات کرائے پھر یو۔پی، میں اور آخر میں بہار میں وہ قتل و غارت گری شروع کر دی جس کی مثال ہلاکو اور چنگیز خان کی بے محابا خون ریزیوں اور آتش فشانیوں میں بھی نہیں ملتی۔ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ جب یہ خبریں وہاں پہنچیں تو لازمی تھا کہ اس سے ان کا خون کھول جاتا۔ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ اپنے مظلوم بھائیوں کے خون کا بدلہ یہاں کے ہندوؤں سے لے لیں۔ کہا جاتا ہے کہ "جنگ اور محبت میں ہر حربہ جائز ہوتا ہے" لیکن یہ کچھ ان کے ہاں جائز ہوتا ہے جن کے سامنے زندگی کی کوئی مستقل اقدار نہیں ہوتیں۔ قائدِ اعظمؒ کی ساری جنگ اپنی مستقل اقدار کے تحفظ اور استحکام کے لئے تھی۔ ان کے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعویٰ پر تھی کہ ہم ایک ایسا خطۂ زمین چاہتے ہیں جس میں ہم اپنی ان اقدار کو فروغ دے سکیں اور ان کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اس لئے وہ کب روا رکھ سکتے تھے کہ بہار کے مسلمانوں کے قتلِ عام کا انتقام پنجاب کے ہندوؤں سے لیا جائے۔ انہوں نے ۱۱ نومبر ۱۹۴۶ء کو اپنی قوم کے نام ایک ضبط انگیز اپیل شائع کی جس میں کہا کہ:-

> میں خدائے عظیم سے دُعا کرتا ہوں کہ مسلمان کے دامن پر وہ بدنما داغ نہ لگے جس کا مظاہرہ مظلوم مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم کر کے بہار میں کیا گیا ہے۔ ہمیں تہذیب و شرافت کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں، ان سے ہمارا کلیجہ چھلنی ہو رہا ہے لیکن ہم مسلم اکثریت والے صوبوں میں بے گناہوں کو مار کر اپنا دل ٹھنڈا نہیں کریں گے۔ میں مسلمانوں سے پُرزور اپیل کروں گا کہ وہ جہاں بھی اکثریت میں ہوں غیر مسلموں کی حفاظتِ جان اور مال کے لئے جو کچھ بھی ممکن ہو کریں۔ اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے ہیں، جو بے گناہ مسلمان شہید کیے گئے ہیں یا زخمی ہوئے ہیں یا مال اسباب لوٹا گیا ہے، ان کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ وہ سمجھ لیں کہ انہوں نے جنگِ پاکستان اور آزادی کے لئے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔

برادرانِ عزیز! قائدِ اعظمؒ کی وہ عظمتِ کردار جس کی قوّت سے انہوں نے اس عظیم جنگ کو جیتا تھا،

اس محاذ میں تیسرا فریق مخالف خود مسلمانوں کے وہ گروہ تھے جو تحریک پاکستان کی مخالفت میں ہندوؤں سے بھی چار قدم آگے تھے ۔۔ نیشنلسٹ علماء، جمعیت العلماء، (مولانا آزاد، مولانا مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید وغیرہ)، احرار، مسلم مجلس، انصار، سُرخپوش، جماعت اسلامی ۔۔۔ انہوں نے اس مطالبے کی مخالفت میں کیا کچھ کیا، اب اس کے تذکرہ سے کیا حاصل!

سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

آخری سازش

ان سب کے علی الرغم، قائداعظم نے یہ جنگ جیت لی اور ہندوستان تقسیم ہوگیا ۔۔۔ لیکن ہم منزل پر پہنچ کر ایک ایسی سازش کا شکار ہوگئے جس کے لگائے ہوئے زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوسکے ۔۔۔ بلکہ یوں کہیئے کہ جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے، وہ سرطان (کینسر) کی طرح پھیلتے چلے جارہے ہیں۔

تقسیم ہند کے سلسلہ میں اصول یہ طے پایا تھا کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہ پاکستان کا حصّہ قرار پاجائے۔ یہ اصول انگریز اور ہندو دونوں نے تسلیم کرلیا تھا لیکن اس کے بعد پہلے تو اس قسم کی سازشیں شروع ہوئیں کہ سرحد جیسے علاقہ میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ۹۰ فیصد سے کم نہ تھی ۔۔۔ استصواب رائے کرایا گیا (کہ وہ ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ) خدا خدا کرکے یہ مرحلہ طے ہوا تو یہ چال چلی گئی کہ ملک اصولی طور پر تقسیم پہلے ہوجائے اور حدود بندی بعد میں ہو۔ اور اس حدود بندی کا فیصلہ ۔۔۔ (ARBITRATION) یعنی ثالثی کی رُو سے ہو۔ آج اتنے عرصہ کے بعد ہم نہیں کہہ سکتے کہ قائداعظمؒ کے پیش نظر وہ کون سی مصلحتیں تھیں یا وہ کن دشواریوں میں گھرے ہوئے تھے کہ انہوں نے ایسے بنیادی مسئلہ میں انگریز کی ثالثی قبول کرلی۔ لیکن اس کا نتیجہ بہرکیف یہ ہوا کہ ہم نے جیتی ہوئی بازی ہار دی۔ گورداسپور کا ضلع مسلم اکثریت کا علاقہ تھا، اور کسی کو اس کا وہم وگمان بھی نہ تھا کہ یہ ضلع ہندوستان کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ اس ضلع کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگایئے کہ اگر یہ پاکستان کے ساتھ ملا دیا جاتا تو کشمیر کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ یہی وہ ضلع ہے جس سے ہندوستان کو کشمیر کی طرف جانے کا راستہ ملا۔ صاف نظر آتا ہے کہ ہندو اور انگریز دونوں کے پیش نظر اس وقت کشمیر کا الحاق تھا۔ اس کے لئے کیا یہ گیا کہ اس ضلع کو ہندوستان کے ساتھ ملا دیا اور اسی سے یہ سارے مسائل پیدا ہوگئے جو مسلسل اٹھارہ سال سے ہمارے لئے وجہ اسوہانِ روح بن رہے ہیں اور نہ معلوم کب تک بنتے چلے جائیں گے۔ یہ وہ آخری تحفہ ہے جو ہمیں انگریز جاتے جاتے دے گیا۔ اس فریب کاری کا ذکر قائداعظمؒ نے اگست ۱۹۴۷ء میں لاہور کی ایک تقریر میں ان الفاظ میں کیا: ـ

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیسی کیسی بے انصافیاں اور زیادتیاں روا رکھی گئی ہیں تقسیم کا کام ختم ہو چکا ہے اور ہمارے علاقے کو جس قدر کم کیا جا سکتا تھا کر دیا گیا۔ باونڈری کمیشن کا فیصلہ نہ صرف غیر منصفانہ ہے بلکہ بدنیتی پر بھی مبنی ہے۔ اسے قانونی فیصلہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سیاسی فیصلہ ہے بہر حال اب فیصلہ ہو چکا ہے ہم نے جو وعدے کئے ہیں انہیں ہم پورا کریں گے۔ ہم اپنے الفاظ پر قائم ہیں۔

یہ سب سازشیں کس مقصد کے لئے کی جا رہی تھیں، اس کی غمازی لارڈ ایٹلی (جو اس وقت برطانیہ کے وزیر اعظم تھے) کی وہ تقریر کرتی ہے جو انہوں نے پارلیمان میں (INDEPENDENCE BIL) پیش کرتے وقت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔

> ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے لیکن مجھے اُمید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔
>
> (پاکستان ٹائمز ۱۵ ۱۲/۴۵)

برطانیہ کا وزیر اعظم یہ کہہ رہا تھا۔ ہندو، پاکستان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا ___ اور قائد اعظمؒ لارڈ ماونٹ بیٹن سے کہہ رہے تھے کہ

> ہم کوشش کریں گے کہ دولتِ برطانیہ، ہندوستان، اور ہمسایہ حکومتوں سے ہمارے تعلقات خوشگوار رہیں۔

ضمناً، یاد آگیا ___ جب لارڈ ماونٹ بیٹن، ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو انتقالِ اختیارات کے سلسلہ میں کراچی آیا ہے تو اس نے پاکستان کے گورنر جنرل (قائد اعظمؒ) سے کہا تھا کہ پاکستان کو حکومت مل رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جہاں تک غیر مسلم اقلیتوں کا تعلق ہے، پاکستان شہنشاہ اکبر کی (رواداری کی) پالیسی پر عمل کرے گا۔ اس پر قائد اعظمؒ نے چمک کر جواب دیا کہ ہمیں اس تلقین کی ضرورت نہیں۔ ہم ان روایات کے حامل ہیں جن کی رُو سے ہمیں غیر مسلموں کے ساتھ رواداری ہی کا نہیں بلکہ فیاضانہ سلوک کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

تحسین یہ تھا برادرانِ عزیز! ملتِ اسلامیہ کا وہ چراغ جس نے لاکھ اندھیروں کا مقابلہ کیا۔ اور کامیاب و کامران دُنیا سے رخصت ہوا۔ ان کی وفات پر دُنیا کے عظیم سیاستدانوں، اور مفکروں نے ان کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ حتّٰی کہ لندن ٹائمز جیسے اخبار نے لکھا۔

> ... نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک قوم ہے۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ...

جیسی حیلہ سازی نہ تھی۔ بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو ہدف بناتے تھے اس پر براہِ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

غیر تو یہ کہہ رہے تھے، لیکن دکس قدر مقامِ تأسف ہے کہ) "خود" "اپنے" ـــ جو ہندوستان سے بھاگ کر پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور تھے اور پاکستان نے انہیں ان کی مسلسل مخالفت کے باوجود، نہایت کشادہ ظرفی سے پناہ دی تھی ـــ اسی قائداعظمؒ کے متعلق یہ زہرافشانی کر رہے تھے کہ:۔

اس پورے گروہ میں ایک کوہ کن بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازیگروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشہ دکھایا۔ اور اس قوم کی رہی سہی عزت خاک میں ملا دی جن کے وہ نمائندے تھے۔

(ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۴۸ء)

بسترِ مرگ سے

ایسا نظر آتا ہے کہ قائداعظمؒ کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں ہندوستان کے مذموم عزائم کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بسترِ مرگ سے کہا تھا۔

خدائے عظیم و برتر کی قسم، جب تک ہمارے دشمن ہمیں اُٹھا کر بحیرہ عرب میں نہ پھینک دیں ہم ہار نہ مانیں گے۔ پاکستان کی حفاظت کے لئے میں تنہا لڑونگا۔ اس وقت تک لڑونگا جب تک میرے ہاتھوں میں سکت اور جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے۔ مجھے آپ سے کہنا ہے کہ اگر کوئی ایسا وقت آجائے کہ پاکستان کی حفاظت کے لیئے جنگ لڑنی پڑے تو کسی صورت میں ہتھیار نہ ڈالیں۔ پہاڑوں میں، جنگلوں میں، اور دریاؤں میں جنگ جاری رکھیں۔

(ڈاکٹر ریاض علی شاہ کی کتاب۔ قائداعظمؒ کے آخری ایام)

ہمارے فوجیوں کے کردار

سترہ سال کے بعد، بالآخر وہ وقت بھی آگیا اور للہ الحمد کہ ہماری فوجوں نے قائداعظمؒ کی توقعات کو پورا کر دکھایا۔ وہ اس وقت زندہ ہوتے تو اپنے ان شاہین بچوں پر بڑا فخر کرتے۔ نہ صرف اس لئے کہ انہوں نے میدانِ کارزار میں بے مثال جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ انہوں نے سخت آزمائش کے وقت اپنی ان اخلاقی روایات کو قائم رکھا ہے جس کی تلقین سانحۂ بہار کے سلسلہ میں مسلم اکثریت کے صوبوں سے کی گئی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حالیہ جنگ میں جہاں ہندو فوجوں نے ہماری شہری آبادیوں کو تباہ و برباد کیا وہاں ہماری عصمت و عفت پر بھی ڈاکے ڈالے۔ وہ ہمارے [illegible]

سے دیکھا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اس کے بعد انہی سپاہیوں کا ہندوؤں کے علاقوں پر قبضہ ہوا۔ اب موقعہ تھا کہ یہ ہندوؤں کی اس کمینہ روش کا انتقام یہاں کی عورتوں کی بے حرمتی سے لیتے۔ لیکن انہوں نے کیا کیا۔ اس کے متعلق مجھ سے نہیں، خود ہندوؤں کے ذمہ دار لیڈروں کی زبان سے سنیئے۔ ہندوستان کی لوک سبھا (پارلیمان) میں، وہاں کے ایک ممبر (مسٹر کپور سنگھ) نے کہا۔ کہ فاضلکا سیکٹر میں مسلمان سپاہی نے ہندوستانی عورتوں کو اغوا کیا۔ اس پر وہاں کے وزیرِ دفاع مسٹر چوہان نے کہا کہ میرے علم میں ابھی تک کوئی ایسا واقعہ نہیں آیا۔ تاہم میں اس کی تحقیق کروں گا۔ اور اس تحقیق کے سلسلہ میں مشرقی پنجاب کے وزیرِ اعظم مسٹر رام کشن نے اعلان کیا کہ

پاکستانی سپاہیوں نے کسی ایک عورت کو بھی اغوا نہیں کیا۔

انتقام لینے کی قوت رکھتے ہوئے، ضابطۂ اخلاق کی اس طرح پابندی کرنا، بڑی ہمت کا کام ہے اور اس بلندیٔ کردار اور ضبطِ نفس کا مظاہرہ اُن فوجی نوجوانوں کی طرف سے ہوا۔ جنہیں ہمارا "مذہب پرست" طبقہ "ٹیڈی بائز"۔۔۔ "ٹیڈی بائز" کہہ کہہ کر بدنام کیا کرتا تھا۔

خطرہ کا مقام

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قائداعظم نے اپنے بسترِ مرگ سے پاکستان کی مدافعت کے لئے جو تلقین کی تھی، ہماری افواج نے اسے میدانِ جنگ میں پورا کر دکھا دیا لیکن اس کے بعد اب ہم پھر اس مقام پر آگئے ہیں جس مقام پر اگست ۱۹۴۷ء میں تھے یعنی جب ہماری جنگ میدانِ کارزار سے ہٹ کر بساطِ سیاست کی طرف منتقل ہوگئی تھی اور جہاں ہم تاشقند کو مان کر اتنا بڑا فریب کھا گئے تھے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اب ہم اس تجربہ سے فائدہ اٹھائیں گے اور دوبارہ اس قسم کا دھوکا نہیں کھائیں گے۔ کیونکہ ——— مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا

کامیابی کا راز

اس قسم کے سب خطرات میں، کامیابی کا راز کیا ہے، اس کے متعلق قائداعظمؒ ہی کی زبان سے سنیئے۔ انہوں نے پاکستان کی جنگ لڑتے ہوئے کہا تھا۔

اس وقت میدانِ سیاست میں ہندو مسلمانوں کی جنگ ہو رہی ہے لوگ پوچھتے ہیں کہ کون فتحیاب ہو گا۔ علمِ غیب تو خدا کو ہے۔ لیکن میں ایک مسلمان کی حیثیت سے علی رؤس الاشہاد کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر شبات و استقامت پر کاربند رہیں اور اس ارشادِ خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی طاقت یا کئی طاقتوں کا مجموعہ بھی مغلوب نہیں کر سکتا۔

قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر شبات و استقامت پر کاربند رہنا اور اس ارشادِ خداوندی کو سامنے رکھنا کہ مسلمان سب بھائی ہیں ——— اس [illegible] حاصل ہوتی ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ [illegible]

حقائق و عبر

۱۔ تیری آواز مکے اور مدینے

ملک کا مشہور ہفت روزہ اخبار چٹان اگرچہ دیوبندی مسلک کا ترجمان ہے لیکن مولویانہ تعصب سے پاک ہے محترم پرویز صاحب کے بارے میں جماعتِ اسلامی جو غلط پروپیگنڈہ کرتی رہتی ہے اس نے کبھی اسے اہمیت نہ دی۔ بلکہ اُن کی قرآنی تحقیق کو سراہا، اس اخبار کا صفحہ اوّل اعلیٰ تحریروں اور علمی تحقیق کے لئے وقف ہے۔ اس انتخاب میں اخبار دوسرے علماء کی علمی تحقیق کے ساتھ ساتھ محترم پرویز کی قرآنی تحقیق بھی پیش کرتا رہتا ہے۔ قربانی کے بارے میں محترم پرویز صاحب کی قرآنی تحقیق نے طبقۂ علماء کو مشتعل کر دیا تھا اور چونکہ یہ ان کے پیٹ کا مسئلہ تھا اس لئے انہوں نے محترم پرویز صاحب پر کفر کا فتویٰ لگانے سے بھی احتراز نہ کیا۔ لیکن قرآنی حقائق کا زیادہ دیر تک انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ علمائے دیوبند کا یہ ترجمان اخبار محترم پرویز صاحب کی قربانی کے بارے میں قرآنی تحقیق کو اپنے صفحہ اوّل کے انتخاب میں ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:۔

"قرآن کریم نے بالتصریح کہا ہے کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ ان کا گوشت تم خود بھی کھاؤ اور دوسرے محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ لہٰذا صرف اتنے اونٹ ذبح کئے جائیں گے جن کا گوشت کھانے کے کام آسکے۔ بنابریں جس طرح آج کل حج کی تقریب پر لاکھوں کی تعداد میں بھیڑ بکریاں ذبح کر کے زمین میں دبا دی جاتی ہیں اور تمام دنیا میں عیدالاضحٰی کی تقریب پر جانور ذبح کئے جاتے ہیں قرآن کریم سے اس کی تائید کسی طرح بھی نہیں ہوتی۔" (ماخوذ از تفسیر مطالب الفرقان جلد ۳ صفحہ ۲۵۰)

(ہفت روزہ چٹان بابت ۱۴ر دسمبر ۱۹۸۷ء ص۳)

۲۔ جماعتِ اسلامی اور علماء

[illegible]

وقتاً فوقتاً بے وقوف بناتی رہتی ہے۔ اور ان کے بارے میں اس جماعت کا جو صحیح تأثر ہے وہ سامنے نہیں آنے دیتی۔ لیکن بعض اوقات جدید تعلیم یافتہ طبقہ، جو علماء کے طرزِ عمل کی وجہ سے اسلام سے بھی بدظن ہوتا جا رہا ہے، کو خطاب کرتے وقت جماعتِ اسلامی کے لیڈر، علماء کے بارے میں اپنے دل کی بات بھی کہہ دیتے ہیں۔ ایسی ہی دل کی بات، جماعتِ اسلامی کے ترجمان ہفت روزہ ایشیاء کی ۱۳ دسمبر ۸۷ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں شائع ہوئی ہے :-

"ایک اور سخت بیماری کی علامت میرے نزدیک یہ ہے کہ ہمارے شہروں اور دیہات کی مسجدوں میں لوگ اطمینان سے بیٹھ کر ان خطیبوں کی تقریریں سنتے ہیں جن کی زبان سے دوسروں کے لئے گالیاں اور الزام تراشیاں بارش کی طرح جھڑتی ہیں اور کوئی اللہ کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ کیا یہ مسجدیں انہی کاموں کے لئے بنی تھیں؟ سیرتِ پاک کے نام سے جلسے منعقد کئے جاتے ہیں اور ان میں سیرت کے بجائے سارا وقت کسی شخص کو گالیاں دینے پر صرف کر دیا جاتا ہے۔ مجلسِ وعظ ہوتی ہے تو اس میں خدا اور رسول کی تعلیمات پیش کرنے کی بجائے سب و شتم ہوتا ہے، بہتان تراشیاں ہوتی ہیں۔" (ہفت روزہ ایشیاء ۱۳ دسمبر ۱۹۸۷ء صفحہ ۲۱)

۳- اولیاء اللہ اپنا جنازہ خود پڑھاتے ہیں!

اولیاء اللہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنا جنازہ خود پڑھاتے ہیں۔ ہم سے بعض احباب نے دریافت کیا ہے کہ کیا یہ گپ ہے یا حقیقت ـــــ، تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ ان اولیاء کے جو حالاتِ زندگی کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں ان میں متعدد ایسے واقعات کا ذکر ہے مثلاً مخدوم علاؤ الدین صابر کلیری کہ جن کا مزار ہندوستان میں واقع ہے، اور پاکستان اور ہندوستان میں ان کے لاکھوں مرید، ہر سال ان کا عرس مناتے ہیں، ان کے حالاتِ زندگی میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنا جنازہ خود پڑھایا تھا۔ خیال رہے کہ ان کے عرس میں شرکت کے لئے جو جماعت پاکستان سے جاتی ہے، وہ بڑے بڑے اہلِ علم لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے، اور وہ سب اس واقعہ کو حقیقت سمجھتے ہیں :-

اولیاء کے حالاتِ زندگی کے بارے میں مشہور کتاب تذکرۂ اولیائے چشت کے صفحات [illegible] پر یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے :-

"حضرت مخدوم علاؤ الدین صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ نے وصال سے قبل [illegible]

ایک علاقہ میں اپنا نائب بنا کر بھیجا تھا اور حکم دیا کہ فرائض سے فراغت پا کر واپس لوٹ آنا اور جب تم کلیر کی سرزمین پر قدم رکھو گے تو ٹھوکر کھا کر زمین پر گر پڑو گے تو سمجھ لینا کہ میرا مرشد دنیا سے رحلت کر گیا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب مرشد کی خانقاہ پر پہنچے تو دیکھا کہ ہزاروں افراد حضرت صابرؒ کی نماز جنازہ پڑھنے کے لئے موجود ہیں۔ لیکن نماز جنازہ پڑھانے کی کوئی جسارت نہیں کرتا، کیونکہ نماز جنازہ ایسے شخص کو پڑھانا تھی جو حضرت صابرؒ سے زیادہ اعلیٰ مقام رکھتا ہو۔

آخر کار حاضرین نے دیکھا کہ ایک گھوڑے پر سوار نقاب پوش اترا۔ اس نے گھوڑا باندھا اور نماز جنازہ پڑھائی۔ جب نقاب پوش واپس جانے کے لئے گھوڑا کھولنے لگا تو حضرت حمید الدین ناگوری نے ہزاروں افراد کی معیت میں دریافت کیا کہ اے اللہ کے بندے تم کون ہو؟ کیا نام ہے؟ کہاں جانا چاہتے ہو؟ ذرا بتاتے جانا۔ نقاب پوش نے کہا، اے حمید الدین! اگر حقیقت کا انکشاف چاہتے ہو تو عوام کے مجمع کو یہاں سے برخواست کر دو کیونکہ ؎

خاصاں دی گل عاماں اگے نہیں مناسب کرنی مٹھی کھیر پکا محمدؐ کتیاں اگے دھرنی

جب لوگ چلے گئے تو نقاب پوش نے نقاب اُٹھایا تو شیخ حمید الدین ناگوری نے دیکھا کہ حضرت صابر کلیریؒ خود سامنے کھڑے ہیں۔ عرض کیا کہ حضرت ایک طرف تو آپ کا جنازہ پڑا ہے اور اُدھر آپ بقید حیات موجود ہیں۔ فرمایا وہ مقام فنا ہے اور یہ مقام بقا۔"

(بحوالہ ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث بابت ۱۸ دسمبر ۱۹۸۷ء صفحہ ۴)

۴۔ فرقۂ اہل حدیث کا ولی اللہ

اولیاء کے بارے میں اوپر والی تفصیلات، فرقۂ اہل حدیث کے ایک اخبار سے نقل کی گئی ہیں، اس قسم کے واقعات نقل کرنے سے اس فرقہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں نے جو بعض صوفیا کو ولی اللہ کا درجہ دے رکھا ہے ان کی کوئی حقیقت نہیں، لیکن حیرت کی بات ہے کہ یہ بت شکن جب اپنے علماء کا ذکر کرتے ہیں تو انہیں خود اولیاء اللہ کا درجہ دے دیتے ہیں۔ ان کے فرقے کے ایک عالم، حکیم میر نور الدین کے حالات زندگی، اسی فرقہ کے ایک دوسرے اخبار میں شائع ہوئے ہیں، تو انہوں نے حکیم صاحب کو ولی اللہ کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ ہفت روزہ اہل حدیث کی یکم جنوری ۱۹۸۸ء کی اشاعت کے صفحہ ۱۱ پر یہ دعوے کیا گیا ہے کہ اگر کسی نے ولی اللہ دیکھنا ہے تو حکیم نور الدین کو دیکھ لے۔

اولیاء کے عقیدت مند اپنے محبوب اولیاء کے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ اہل حدیث حضرات نے اپنے اس ولی اللہ کے کارنامے ان الفاظ میں بیان کئے ہیں:-

"لائل پور شروع میں خلافت، کانگریس اور پھر مجلس احرار کی سرگرمیوں کا مرکز رہا تھا۔ حکیم نورالدین ایک درویش صفت انسان تھے۔ انہوں نے کانگرس اور مجلسِ احرار کے رہنما کی حیثیت سے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں" (ایضاً)

اگلے صفحہ پر ہندو کانگریس کے لیڈروں کے نزدیک ان کے مرتبے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۳۶ء میں لائل پور آئے تو ضلع کونسل کے قریب کسی کے مکان پہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ حکیم صاحب انہیں ملنے کے لئے گئے۔ جواہر لال نہرو کو پتہ چلا تو انہیں سڑک تک لینے کے لئے آئے۔ اندر لے جا کر بٹھایا، کھڑے کھڑے تقریباً آدھ گھنٹہ تک باتیں کرتے رہے۔ نہرو بار بار حکیم صاحب سے التجا کرتے تھے کہ آزادی وطن کے لئے دعا کیجئے۔ پھر سڑک تک انہیں چھوڑنے کے لئے گئے۔ (ایضاً صفحہ ۱۲)

آج برصغیر کا بچہ بچہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ ہندو کانگریس، یہاں سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے پر تلی ہوئی تھی، اور جماعتِ اہلِ حدیث کے ولی اللہ نے اپنی خدمات اس جماعت کو پیش کر رکھی تھیں!

۵- دوسری صدی کا امام پانچویں صدی کے صوفی کا محتاج

حضرت امام احمد بن حنبلؒ دوسری صدی ہجری میں پیدا ہوئے آپ اہلِ سنت کے ایک فقہی مذہب جو ان کے نام پر "حنبلی مذہب" کے نام سے مشہور ہے کے بانی ہیں۔ اس مذہب کے پیروکاروں کا صوفیا کے بارے میں جو رویہ تھا اس کا اندازہ امام محمد بن عبدالوہاب کے طرزِ عمل سے ہوتا ہے جو حنبلی مذہب کے پیروکار تھے اور اسی وجہ سے سعودی عرب کے لوگ بھی زیادہ تر اسی مذہب کے پیروکار ہیں۔ لیکن صوفیا کے عقیدت مندوں کے خیال کے مطابق، امام صاحب اپنے سے تین صدی بعد پیدا ہونے والے ایک صوفی کو نہ صرف پیر کہ اپنا امام سمجھتے تھے بلکہ خود فرماتے تھے کہ وہ علم شریعت اور علم حال میں ان کے محتاج ہیں۔ علامہ ڈاکٹر القادری صاحب کے ماہنامہ "منہاج القرآن" کی دسمبر ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"حنبلی علماء عام طور پر فرماتے ہیں کہ جب حضرت شیخ محی الدین رضی اللہ عنہ اور شیخ جلال بن بطو کے

ساتھ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کے مزار اقدس کی زیارت کے لئے حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ امام احمد بن حنبل نے اپنی قبر انور سے باہر آکر حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کا استقبال فرمایا۔ اور آپ کو ایک خوبصورت پوشاک عطا کی اور کہا اے عبدالقادر میں علم شریعت، علم حقیقت، علم حال اور فعل حال میں آپ کا محتاج ہوں۔

(ماہنامہ منہاج القرآن بابت دسمبر ۱۹۸۷ء صفحات ۴۵، ۴۶)

طلوعِ اسلام یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اپنے آپ کو ایک جدید تعلیم یافتہ کہنے والا پی۔ ایچ۔ ڈی ڈاکٹر اس قسم کے خیالات کی تبلیغ بھی کر سکتا ہے۔

۶۔ حضرت اور اعلیٰ حضرت

ہم نے طلوعِ اسلام کے پچھلے شمارے میں ایک مستشرق کے حوالے سے لکھا تھا کہ ہمارے علماء رسول اللہؐ کے لئے تو حضرت کا لفظ استعمال کرتے ہیں، لیکن اپنے علماء کے لئے "اعلیٰ حضرت" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اعلیٰ حضرت کا مرتبہ رسول اللہؐ سے بلند تھا۔ نیم تعلیم یافتہ علماء کو تو جانے دیجئے اپنے آپ کو جدید پڑھا لکھا عالم دین قرار دینے والے صاحب جناب ڈاکٹر طاہر القادری نے بھی یہی اسلوب اختیار کر رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے رسالہ منہاج القرآن بابت دسمبر ۱۹۸۷ء میں متعدد مقامات پر اپنے ایک بزرگ کے لئے "اعلیٰ حضرتؒ" کا لفظ بار بار استعمال کیا ہے (ملاحظہ ہوں صفحات ۱۹، ۲۰) لیکن رسول اللہؐ کے لئے صرف حضرت اور آپؐ کا لفظ استعمال کیا ہے کیا وہ یہ وضاحت کریں گے کہ وہ بے خیالی میں ایسا کر جاتے ہیں، یا واقعی ان کے پیر و مرشد کا رتبہ معاذ اللہ رسول اللہؐ سے بلند ہے

۷۔ جمہوریت خلافِ اسلام ہے

فرقہ اہلِ حدیث کے ترجمان ماہنامہ 'محدث' نے اپنی دسمبر ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں جمہوری تماشا اور اسلام کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا ہے جس میں جمہوری نظام کو خلافِ اسلام قرار دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے۔

ان علمائے کرام، سیاست دانوں اور حکمرانوں سے ہماری یہ گذارش ہے کہ اس نظامِ حکومت

پر لعنت بھیجیں جو ان کے ہم جنسوں، ہم وطنوں اور ہم مذہبوں پر صرف نالیاں، گلیاں تعمیر کرنے کے جھوٹے وعدوں پر تباہی و بربادی کے مہیب سائے پھیلا دیتا اور موت کے پردے تان دیتا ہے لیکن سمندر پار کے ایک کافر ملک سے آشیر باد کا آوازہ یوں گونجتا ہے کہ :-

"حکومتِ پاکستان نے انتخابات کے ذریعے راست سمت میں قدم اٹھا دیئے ہیں!" (پاکستان میں متعین امریکی سفیر کا بیان ـــ ملخصاً)

(صفحہ ۱۸۳)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب جمہوری نظام خلافِ اسلام ہے، تو پھر کونسا نظامِ حکومت اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے، اس کی وضاحت اسی جماعت کے ایک ہفت روزہ "الاعتصام" میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

ملوکیت کتاب و سنت پر مبنی ہے "مگر سعودی عرب کے متعلق ان کا ارشاد درست نہیں۔ وہاں نظامِ سلطنت کتاب و سنت پر مبنی ہے۔"

(شمارہ ۲۵ دسمبر ۱۹۸۷ء صـ ۳)

دیرینہ قرآنی رفقا کو صدمہ!

ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) کی ایگزیکٹو کونسل اور طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کے رکن محترم میاں **محمد اقبال سرور** و برادران کو پچھلے دنوں جانکاہ صدمہ سے دوچار ہونا پڑا، جس میں محترم میاں صاحب کے **داماد، کرنل سلیم رضا،** ایک ہوائی حادثے میں **جاں بحق** ہو گئے۔

احباب ادارہ/ٹرسٹ، مرحوم کی بے وقت موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائیں اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)

تصوّف کا منبع — قرآن و حدیث؟

جمعہ ۱۸ دسمبر ۸۷ء کی رات، پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام "بزم" میں جو (غالباً) ڈاکٹر سی اے قادر مرحوم کی یاد کے لئے مختص تھا۔ اُن کی ایک تقریر (یومِ اقبال کے سلسلہ میں) دکھائی گئی۔ اس تقریر میں موصوف نے مسلمانوں کے ادبار کا اقبالی تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقبال نے اس کی تین وجوہات بتائی ہیں۔ جن میں سے ایک اُن کے الفاظ میں، یہ تھی۔

"مسلمانوں نے ایک خاص قسم کا تصوّف قبول کیا۔ تصوّف دو قسم کا ہے۔ ایک تصوّف کا منبع قرآن و حدیث ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

نہ جانے ہمارے دانشوروں کو اس کا احساس بھی ہے یا نہیں کہ ایسی بات کہہ کر وہ قرآن کریم پر بہت بڑا افترا باندھتے ہیں۔ اور یہ کہ قرآن پر افترا باندھنے والوں کا اللہ نے قرآن کریم ہی میں کیا انجام بتایا ہے (کیونکہ قرآن پر افترا، درحقیقت قرآن نازل کرنے والے "اللہ" پر افترا ہے)؟

جس اقبالؒ کے حوالے سے ڈاکٹر سی اے قادر مرحوم بات کر رہے تھے۔ اُن کا ایک مقالہ بعنوان "تصوّف۔ شعبدہ بازوں کی کمند" ہم طلوعِ اسلام کے شمارہ دسمبر ۱۹۸۷ء میں پیشِ خدمت قارئین کر چکے ہیں۔ اس میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے:

واضح رہے کہ اسلام کا آفتاب، تاریخ کے روزِ روشن میں اُفق پر جلوہ گر ہوا۔ ہمارے جمہوریت پرور پیغمبرِ اعظمؐ نے عاقل و دانشمند اصحابؓ میں زندگی بسر کی اور انہی میں کام کرتے رہے۔ ان اصحابؓ نے ایک ایک لفظ آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا جو اُس پیغمبرِ اعظمؐ کی مقدس و بابرکت زبان پر جاری ہوا۔ حضورؐ کی تعلیمات میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جسے مخفی کہا جا سکے۔ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ زندگی کی مسرت اور روشنی سے لبریز ہے۔ یہ تاریک اور قنوطیت افزا تصوّف کے سلسلہ وجود جاری کرنے ہی سے پاک و مبرا نہیں بلکہ ان تمام مذہبی تعلیمات کے خلاف کھلا ہوا

[illegible]

غور فرمائیے اقبالؒ کہتے ہیں کہ قرآنِ مجید تصوف کے لئے وجہِ جواز مہیا کرنے سے پاک و مبرا ہے اور ڈاکٹر سی اے قادر مرحوم فرماتے ہیں کہ ایک تصوف کا منبع قرآن و حدیث ہے۔

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی

اس موضوع پر محترم پرویزؒ صاحب کی حقیقت کشا کتاب "تصوف کی حقیقت" حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم ان کی اس کتاب سے وہ اقتباس درج ذیل کرتے ہیں جس میں انہوں نے تصوف اور الدین (اسلام) کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

"لیکن تصوف کے خلاف، میرے نظریات کی وجہ یہی نہیں کہ اس میں اس قسم کے ذاتی تجربات اور واردات کو فوق الفطرت روحانی مشاہدات سمجھ لیا جاتا ہے۔ میرے اختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تصوف کے عقائد، اسلام کی ساری عمارت کو منہدم کر دیتے ہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے الدین (اسلام) کا مقصود و منتہیٰ یہ ہے کہ:۔

۱۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا جائے اور

۲۔ ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے جس کی رُو سے قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، ان قوتوں کو نوعِ انسانی کی منفعت، بہبود اور نشوونما کے لئے اس طرح صرف میں لایا جائے کہ یہاں کی زندگی بھی سرفرازیوں اور کامرانیوں کی ہو، اور انسان اخروی زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل بھی ہو جائے۔

یہ ہے دین کا ماحصل۔ تصوف، ان ہر دو مقاصد کے خلاف ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ:۔

۱۔ یہ کائنات باطل ہے۔ اس کا درحقیقت وجود ہی نہیں۔ لہٰذا فطرت کی قوتوں اور ان کی تسخیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور

۲۔ انسانی زندگی کا مقصد ایک فرد کی "روحانی" ترقی ہے جو مختلف قسم کے مراقبوں اور ریاضتوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس میں اجتماعیت کا تصور ہی نہیں۔ کشف والہام اور کرامات اسی روحانی ترقی کے مظاہر ہیں۔

۳۔ قرآن اپنی تعلیم اور پیام کو علم و بصیرت کی رُو سے پیش کرتا اور دلائل و براہین کی روشنی میں منواتا ہے۔ تصوف علم و عقل کا دشمن اور دلیل و برہان کا نقیض ہے۔

... اور عقیدہ کے لحاظ سے تصوف اور اسلام ایک دوسرے ...

اور قارئینِ کرام! یہی ہے وہ غارت گرِ دین و دانش تصوف جس کے جام پر جام، آج کل مملکتِ پاکستان کے ذرائع ابلاغ و نشر سے، قوم کے حلق میں مسلسل اُنڈیلے جا رہے ہیں اور ایسا کرنے والے (شاید) اس انتظار میں ہیں کہ دیکھیں قوم اس زہر کو پی کر کتنے دن زندہ رہ سکتی ہے۔ لیکن شاید قرآن اور اس کے نظامِ حیات (الدین) کو نازل کرنے والے اللہ کا یہ ارشاد اُن کی نظروں سے پوشیدہ ہے:۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ ۹/۳۳

(اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو (ضابطۂ) ہدایت اور دینِ حق (الاسلام) دے کر بھیجا ہی اس لئے ہے کہ وہ اسے تمام نظامہائے حیات پر غالب کر دے، چاہے یہ بات مشرکین کو (ان لوگوں کو جو اللہ کے نازل کردہ قرآن کریم کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین ملاتے ہیں) کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

اور ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں اور اپنی سکیموں کو پورا کرنے کی اور اپنے بندوں کو (جماعت مومنین) جن کی زندگی قرآن ہی کے سانچوں میں ڈھلی ہوتی ہے غالب لانے کی پوری پوری قدرت رکھتے ہیں

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ ۵۸/۲۱

اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اور اس کے رسول آخر الامر ضرور غالب آ کے رہیں گے۔ یہ اُس اللہ کا فیصلہ ہے جو ہر قسم کی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے (اس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے قانون کو شکست دے دے۔

محمد عمر دراز

خریدار صاحبان متوجہ ہوں!

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں

پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہِ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔

محمد اسلام
کراچی

پاکستان جل رہا ہے!

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

انسان بھی عجیب مجموعۂ اضداد ہے۔ اس کی رفعتوں کی طرف نگاہ اٹھائیے تو آسمان کے فرشتے اس کے سامنے سجدہ ریز نظر آئیں گے اور اس کی پستیوں کو دیکھئے تو شیاطین اخبث بھی اس سے پناہ مانگتے دکھائی دیں گے۔ اس کے ایمان کے مظاہروں کو سامنے لائیے۔ تو وہ دھکتی ہوئی آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں میں تبسم کناں کود جائے گا لیکن حق و صداقت پر ذرا سی ذاتی منفعت کی خاطر پوری کی پوری متاعِ دین و ملت بلا تامل و توقف بیچ ڈالے گا۔ کچھ اسی ہی نوعیت کے تضادات پچھلے دو سالوں میں کراچی میں دیکھنے اور سننے میں آئے۔ دیکھنے والی آنکھوں نے یہ بھی دیکھا کہ معصوم بچوں، کمزور خواتین اور ناتواں بوڑھے لوگوں کے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لینے کے لئے صف در صف مسلح حملہ آور برسرِ پیکار رہیں اور انہی دیکھنے والی آنکھوں نے یہ بھی دیکھا کہ زخمیوں کی جانیں بچانے کے لئے خون کے عطیات دینے والے قطار در قطار کھڑے ہیں۔

کراچی پہ کیا گذری

گذشتہ ڈیڑھ دو سال میں کراچی پہ کیا گذری؟ یوں تو اس کی روئیداد اخبارات کے سینکڑوں کالموں میں بکھری ہوئی ہے جسے کوئی مؤرخ ہی یکجا کریگا۔ لیکن ایک سرسری سا جائزہ لینے کے لئے روزنامہ جنگ کراچی کے تبصرہ نگار تسنیم انصاری نے حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے جو کچھ تحریر کیا ہے اس کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:۔

وزیر اعظم محمد خان جونیجو دورۂ سندھ کے لئے ۲۰ر اگست کو کراچی پہنچے تو انہوں نے کہا کہ "انشاء اللہ کراچی کے حالات پرامن رہیں گے اور انشاء اللہ یہ صورت حال جاری رہے گی"۔ لیکن صرف پانچ روز بعد کراچی اور [illegible]ر آباد میں خونریز فسادات پھوٹ پڑے اور آگ و لہو کے کھیل نے ایک بار پھر دونوں شہروں کے امن و امان [illegible]ارت کر کے [illegible] میں صدر ضیاء الحق کی جانب سے بہاریوں کے بارے میں ادا کئے گئے [illegible]ت کے بعد [illegible]

سانچے میں ڈھل گئی۔ اکتوبر ۸۶ء میں سہراب گوٹھ پر ایم کیو ایم کے جلوس پر فائرنگ کے بعد خونریز فسادات کا یہ سلسلہ ۱۴ دسمبر ۸۶ء کو سانحہ علی گڑھ کی صورت میں انتہائی عروج پر پہنچا اور پھر وقفے وقفے سے تشدد جوابی تشدد، انتقام در انتقام کے نتیجے میں عصبیت، نفرت اور خونریزی کا شعلہ، بھڑکتی ہوئی آگ میں تبدیل ہو چکا ہے اور یہ آگ اب تک ۱۲۰۰ افراد سے زیادہ کو فرشتۂ اجل کے سپرد کر چکی ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق اس عرصہ میں ۱۰ ہزار سے زیادہ گھر جلائے گئے۔ ہزاروں دوکانیں، ٹھیلے اور پتھارے جلا کر بھسم کر دئے گئے۔ دس ہزار سے زیادہ خاندان خانماں برباد ہوئے۔ ۱۰ ارب روپے سے زیادہ کا نقصان ہوا اور کراچی کی صنعتی و اقتصادی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ سرمایہ کاری کا سلسلہ منجمد ہو گیا ہے، اور روزگار کے مواقع محدود ہو گئے ہیں۔ پورے شہر پر خوف اور سراسیمگی کا راج ہے۔ گھروں سے مرد کام کے لیے نکلتے ہیں تو گھر کی عورتیں اور ننھے منے بچے گھر والوں کے واپس لوٹنے تک دستِ دعا بلند کر کے خیریت سے واپسی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ انسان اپنے سایہ سے لرزاں ہے مگر آگ و خون کا کھیل جاری ہے..... پاکستان قومی اتحاد کی ملک گیر تحریک میں صرف ۱۰۰ افراد نے جانیں دی تھیں۔ ۱۹۵۳ء کی ختم نبوت تحریک میں صرف ۱۵ افراد شہید ہوئے تھے۔ ۱۹۸۳ء کی تحریک بحالیٔ جمہوریت میں ۷۰ افراد مارے گئے تھے اور ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں شہدا کی تعداد مقتولینِ نسلی فسادات کی کل تعداد کا نصف بھی نہیں تھی۔ کراچی کے فسادات نے میرٹھ، بہار، مشرقی پنجاب، دکن، یوپی، صابرہ اور شطیلہ کی خونریزی کو مات کر دیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈیڑھ کروڑ کی آبادی کے اس شہر میں مسلم قومیت معدوم اور پاکستانی قوم مصلوب ہو چکی ہے..... کراچی ملک کا سب سے غیر محفوظ شہر بن گیا ہے۔ دہشت گردی، تخریب کاری، باہمی نفاق، انتشار، اسلحہ کا بے روک ٹوک استعمال محض امن و امان کا مسئلہ نہیں رہا۔ اس شہر میں ایسی فضا ہے کہ آدمی تصور نہیں کر سکتا کہ یہ پاکستان کا حصہ ہے آج پاکستان کے تمام شہروں میں سب سے غیر محفوظ شہر اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ کراچی ہے۔ کراچی جو باب الاسلام ہے، پاکستان کا دل ہے، صوبہ سندھ کا دارالحکومت ہے۔ وہ صوبہ ہے جہاں اسلام سب سے پہلے آیا..... کراچی اور حیدر آباد سے قطع نظر پورے سندھ کے حالات مسلسل تشویشناک صورت اختیار کر چکے ہیں۔ گذشتہ دو سال میں سندھ میں ہزاروں افراد اغوا کئے جا چکے ہیں۔ قتل و غارتگری معمولِ زندگی بن چکا ہے۔ شاہراہوں پر فوجی کانوائے گشت پر رہتے ہیں۔ اندرونِ سندھ عصر کے بعد ہی سناٹا چھا جاتا ہے اور راستے سُنسان ہو جاتے ہیں۔

پاکستان کے باقی تین صوبے بھی باہمی جنگ و جدل۔ فرقہ وارانہ فسادات۔ دہشت گردی اور تخریب کاری کا شکار بنے ہوئے ہیں۔ صوبہ سرحد کے دو شہر پشاور اور مردان میں بموں کے دھماکے اب

معمول بن چکے ہیں۔ سرحد کا علاقہ غیر قانونی مہلک ہتھیاروں کی بین الاقوامی مارکیٹ بنا ہوا ہے۔ ہر شخص دہشت انگیز جان لیوا کارروائیوں کے باعث خوفزدہ اور لرزہ براندام ہے۔ کرم ایجنسی میں قبائلی تصادم میں مزائل راکٹ لانچروں۔ کلاشنکوفوں۔ دستی بموں اور طیارہ شکن توپوں کا آزادانہ استعمال ہو رہا ہے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا بنا ہوا ہے۔ بلوچستان میں افراتفری کا عالم ہے۔ تخریب کار بموں کے دھماکے کر کے اپنی موجودگی اور کامیابی کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ مقامی اور باہر سے آنے والوں کے مفادات میں ٹکراؤ خونریزی کا سبب بن رہا ہے۔ طوری اور میںگل قبائل کے مابین خونریز لڑائی کے دوران سینکڑوں افراد ہلاک اور کئی گاؤں تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے طلباء قلم کی بجائے ہتھیاروں کی زبان استعمال کر رہے ہیں۔ پاکستان دشمن عناصر پیش قدمی کرتے ہوئے پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد سے متصل راولپنڈی اور اس کے بعد پنجاب کے دارالحکومت لاہور تک پہنچ گئے ہیں۔ راولپنڈی اور لاہور میں بموں کے دھماکے اس امر کا مظہر ہیں کہ دہشت پسند اور تخریب کاروں کی زد سے پاکستان کی شہ رگ بھی اب محفوظ نہیں رہی ہے۔ ایک دن میں، وقفے وقفے سے بموں کے تین دھماکوں سے لاہور لرز اٹھا خوف و ہراس کے اس ماحول سے فرقہ پرستوں اور موقع پرستوں نے پورا پورا فائدہ اٹھا کر لاہور اور اس کے قرب و جوار کے اضلاع میں مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے فرقہ وارانہ فسادات کا بازار گرم کر رکھا ہے اقتدار پسند طبقوں نے درسگاہوں کو اسلحہ گاہوں میں تبدیل کیا ہوا ہے۔ خود کار اسلحہ سے لیس طلباء کی مختلف تنظیمیں آپس میں دست و گریباں ہیں۔ غرض یہ کہ پاکستان آگ و خون کا ایک دریا ہے اور پیر کے جانا ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے اُمّت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

اب مجھے یاد آتا ہے میرے باباجی کہا کرتے تھے۔ کتا جب خالی ہڈی کو چباتا ہے تو ہڈی کی نوک دار کرچیں اس کے مسوڑھوں میں چبھ جاتی ہیں اور ان سے خون رواں ہو جاتا ہے جس سے کتے کو لذت محسوس ہوتی ہے۔ کتا سمجھتا ہے کہ یہ لذت ہڈی کی ہے چنانچہ وہ اور تیزی سے ہڈی کو چباتا ہے جس سے خون کی روانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نادان یہ نہیں سمجھتا کہ یہ تو اسی کے جسم کا خون ہے جسے چوس کر لذت محسوس کر رہا ہے۔ کچھ یہی حالت ان نام نہاد مسلمانوں کی ہے، جو اپنے بھائیوں کا خون بہا کر لذت محسوس کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ایسا کر کے وہ اپنے اوپر ہی ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اخباری اطلاعات کے مطابق "پاکستان میں ۱۲۱ سیاسی جماعتیں موجود

کے اسباب

کے علاوہ ہیں جو اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مساجد بنانے کے باوجود اخوتِ اسلامی اور اتحاد بین المسلمین کا درس دیتے نہیں تھکتے اور پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کے لئے چالیس سال سے مصروفِ جہاد ہیں۔ پاکستان اس وقت جس عصبیت، نفاق، انتشار، دہشت گردی اور اندرونی و بیرونی تخریب کاری کے عذاب میں مبتلا ہے ملک کے سیاسی لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں نے اس کے جن اسباب و علل کی نشاندہی کی ہے۔ وہ حد درجہ سطحی نوعیت کے ہیں۔ سیاست دانوں کا اندازِ نظر اس صورت حال میں سب سے منفرد ہے سیاسی جماعتوں کا دعویٰ ہے کہ اگر جماعتی بنیاد پر فوری انتخابات کرا دئے جائیں تو یہ تمام فسادات ختم ہو جائیں گے۔ ان کے خیال میں صورتحال درست کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت سندھ کو برطرف کر دیا جائے۔ سیاسی جماعتوں کی کردار کشی بند کی جائے اور ۱۹۷۳ء کے آئین کو بحال کیا جائے۔ جنرل ضیاء الحق مستعفی ہو جائیں تو ملک کے تمام مسائل چٹکی بجاتے حل ہو جائیں گے۔

• بے نظیر بھٹو کا کہنا ہے کہ عوامی حکومت ہوتی تو کراچی میں خون کی ہولی نہ کھیلی جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں کوئی حکومت نہیں۔ موجودہ صورتِ حال اور فسادات غیر جماعتی انتخابات اور سیاست پر پابندی کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ حکومت نے پٹھانوں اور مہاجروں کو آپس میں لڑایا ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ مڈٹرم انتخابات کی تاریخ کا اعلان کیا جائے اسی سے انتشار، بے چینی اور سیاسی کشیدگی کا خاتمہ ہوگا۔

• عطاء اللہ مینگل کا کہنا ہے کہ فوج کو دوبارہ مسلط کرنے کے لئے کراچی میں ہنگامے کرائے جا رہے ہیں۔ حکومت اپنے مخالفین کے لاکھوں اجتماعات کو کنٹرول کر سکتی ہے وہ اب بے بس کیوں دکھائی دیتی ہے جو خود ایسے اقدامات کر رہی ہے جس سے قومیتوں اور طبقات کی باہمی نفرت میں اضافہ ہو اور ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

• میر غوث بخش بزنجو کا کہنا ہے کہ کراچی میں سب کچھ افغان مہاجرین کا کیا دھرا ہے۔ مقامی آبادی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

• اصغر خاں نے کراچی کے واقعات کا ذمہ دار غیر جماعتی انتخابات کو قرار دیتے ہوئے جماعتی بنیاد پر انتخابات کا مطالبہ کیا ہے۔

• غلام مصطفےٰ جتوئی کے خیال میں ایم کیو ایم اور پی پی آئی ملک کو تباہ کر رہے ہیں۔ جئے سندھ ملک دشمن ہے بے نظیر شیخ مجیب کی پالیسی پر عمل کر رہی ہیں۔

• میاں طفیل محمد نے کراچی کے ہنگاموں کو ایک ماسٹر پلان قرار دیا جو پاکستان دشمنوں نے بہت سوچ سمجھ

کی آگ بھڑکائی ہے۔

• پروفیسر غفور احمد کا کہنا ہے کہ اگر آمریت ناکام ہو جاتی ہے تو وہ اپنی آمریت کو از سرِ نو زندہ کرنے کیلئے گروہی طبقاتی تعصبات کو ہوا دیتی ہے۔ یہ فسادات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ حکومت، صدر اور وزیر اعظم کی نہیں ہے بلکہ چوروں، ڈاکوؤں، اسمگلروں کی حکومت ہے۔ یہ حکومت کی پالیسی کا ایک حصہ ہے کہ چوری اور ڈکیتی اغوا اور اسمگلنگ کرنے والوں کی ہمت افزائی کی جائے۔

• مولانا شاہ احمد نورانی کا خیال ہے کہ ملک میں ہر نفاق اور انتشار کی ذمہ دار جماعت اسلامی ہے۔ میاں طفیل داتا دربار میں جا کر معافی مانگیں۔

• سردار عبدالقیوم صدر آزاد کشمیر نے کہا ہے کہ میں نے کراچی کے فسادات کے بارے میں حکومت کو بہت پہلے آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے بتا دیا تھا کہ لاکھوں روپے کا اسلحہ کراچی پہنچ گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ اسلحہ وہاں استعمال ہوگا۔

• آسمانِ سیاست کی کہکشاں، ایم آر ڈی میں شامل (قومی سطح) کے رہنماؤں نے کراچی کے سنگین مسئلہ پر یا تو شاعری سے کام لیا ہے یا اپنے لسانی گروہوں کی ترجمانی کا فریضہ کامرانی سے ادا کیا ہے۔

• قومی اسمبلی کے اراکین علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری، علامہ شاہ تراب الحق قادری، محمد عثمان نوری اور [illegible]النساء قمر نے ابلاغِ عامہ کے اداروں پر زور دیا ہے کہ وہ اپنی نشریات میں تبدیلی کر کے علامہ اقبال اور دیگر [illegible] شعراء کا ایسا کلام نشر کریں جس سے قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہو۔

فروری ۸۶ء سے اگست ۸۷ء کے اخبارات کے ایک سرسری جائزے کے مطابق سیاسی، مذہبی، [illegible]اجی اور ثقافتی تنظیموں کی جانب سے ۴ ہزار سے زائد اجتماعات یکجہتی، ۱۰۰۰ سے زائد جلسہ ہائے عام [illegible] ہزار سے زائد بیانات، امن و امان، بھائی چارے اخوتِ اسلامی پر مبنی لاکھوں ہینڈ بلز، پوسٹر چھاپے اور بانٹے جا چکے ہیں مگر ان تمام کوششوں کا بظاہر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا بلکہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

حکمران طبقہ

اس ضمن میں سب سے زیادہ افسوسناک اور قابلِ رحم حالت حکمران طبقہ کی ہے۔ جس پر ملک کی سلامتی اور قیامِ امن کی تمام تر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جس کے [illegible]ں امن، سلامتی، جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت کے تمام تر ذرائع اور مواقع موجود ہیں اور جو ملک [illegible] "اسلامی نظام" کے نفاذ کا مدعی اور علمبردار ہے۔ جیسے تیسے قانون پر عمل درآمد کے لئے اس کے پاس [illegible] نعرے ہیں۔ تہیہ کر لیا ہے۔ اجازت نہیں دی جائے گی۔ دہشت گردی [illegible]

کچل دیا جائے گا۔ بموں کے دھماکے کرنے والے تخریب کاروں کو چوراہوں پر پھانسی دے دی جائے گی" وغیرہ وغیرہ۔ دوسری جانب دہشت گرد اور تخریب کاروں کا عزم یہ ہے کہ وہ ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ وہ حکومت سے کسی قسم کی اجازت لینے کے پابند نہیں ہیں۔ عبرتناک سزا وہ نہیں، عوام بھگتے گئیں۔ کچلے بیگناہ جائیں گے وہ نہیں۔ رہا چوراہوں پر پھانسی دینے کا اعلان تو یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ اوّل تو وہ ہاتھ نہیں آئیں گے اور آخر چند ہاتھ آ بھی گئے تو انہیں جیلوں سے فرار ہونے کا گر بھی آتا ہے۔

حکمران طبقہ کی بے بسی کا اندازہ صدر مملکت کے اس مایوس کن بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ حکومت کے پاس کوئی الہ دین کا چراغ نہیں کہ وہ ان دھماکوں کو روک دے۔ آج چار دھماکے ہوئے ہیں کل ایکسو چون ہوں گے۔ ابھی تو شروعات ہیں۔ ہمیں اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ امن کی صورتِ حال بہتر نہیں ہے۔ تخریب کار عناصر پر حکومت کی گرفت کمزور ہے۔ وزیراعظم پاکستان کا ارشاد ہے کہ شہروں میں محلوں کی حفاظت کے لئے ہمیں چوکیداری نظام پر توجہ دینی چاہیئے۔ ۲۳ اگست کو سکھر میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ حکومت لوگوں کو اپنی حفاظت کے لئے کلاشنکوف اور خودکار ہتھیاروں کی فراہمی پر غور کر رہی ہے تاکہ ڈاکو کسی دیہات میں جاتے ہوئے پہلے سوچ لیں کہ دیہاتیوں کے پاس بھی ان جیسے ہتھیار ہیں۔ حکومت کی پریشان نظری کا عالم یہ ہے کہ اسی دن کے پلیٹ فارم سے یہ تجویز بھی پیش کی جاتی ہے کہ امن قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تمام غیر قانونی اور ممنوعہ ہتھیار برآمد کئے جائیں نہ صرف یہ بلکہ لائسنس یافتہ ہتھیار بھی حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ ایک طرف حکومت ملک کی بدامنی کو بین الاقوامی سازش اور بیرونی تخریب کاری کا پیش خیمہ قرار دیتی ہے تو دوسری جانب سندھ کے سیکرٹری داخلہ کا کہنا ہے کہ کراچی اور حیدرآباد کی نسلی کشیدگی کو ہوا دینے میں کسی غیر ملکی ہاتھ کے ملوث ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ صوبائی وزیر "محنت زکوٰۃ عشر اور مذہبی امور" عباس بابا وزیر کا کہنا ہے کہ کراچی اور حیدرآباد کے ہنگامے جماعتِ اسلامی اور پیپلز پارٹی نے کرائے ہیں ان کی پشت پر ولی خان مافیا کا پیسہ تھا۔ وزیراعلیٰ سندھ غوث شاہ کا کہنا ہے کہ دھماکوں میں جماعتِ اسلامی کا ہاتھ خارج از امکان نہیں، حکومت کا ہاتھ دہشت گردوں کی گردنوں تک پہنچ گیا ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عملی اور اجتماعی سیاست سے بالاتر صائب الرائے حضرات ہی ملی قومی اور ملکی مسائل کے سلسلے میں صحیح دیانتدارانہ مشورہ دینے کی حیثیت میں ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں جماعتی سیاست یا فرقہ واریت سے وابستہ لیڈران چاہے وہ عوام کے منتخب نمائندہ ہی کیوں نہ کہلاتے ہوں

علاقائیت کے تنگ دائروں تک محدود ہوتی ہے۔ ان سے یہ توقع وابستہ رکھنا کہ وہ جماعتی عصبیت، فرقہ وارانہ نفرت یا صوبائی تعصب سے بالاتر ہو کر سنجیدگی سے مسائل کی نشاندھی اور ان کا حکیمانہ حل تجویز کر سکیں گے، بے سود ہے۔ ان حضرات کے پیش نظر سب سے بڑا مسئلہ حصولِ اقتدار کا ہے اس کا آسان سا حل یہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق صدارت چھوڑ دیں تو ملک چٹکی بجاتے تمام مسائل اور مشکلات سے نجات پا جائیگا۔

اس حقیقت سے انکار بھی دشوار ہے، کہ حکمران طبقہ کا بیشتر وقت اپنے اقتدار کی حفاظت، استحکام، اور حزب اختلاف کے ساتھ کشتی میں گذر جاتا ہے۔ مسائل کے انبار لگتے چلے جاتے ہیں اور انہیں حل کرنے کا حکمران طبقہ کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا اور جب عوام احتجاج کرتے ہیں۔ تو انہیں سرکاری اعداد و شمار کا سنا کر خاموش کرانے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً جب حکمران طبقہ سے کہا جاتا ہے کہ رشوت عام ہو چکی ہے۔ کسی کا کوئی جائز کام رشوت کے بغیر ہوتا ہی نہیں۔ اربوں روپے رشوت خور ہضم کر جاتے ہیں۔ اس طرف توجہ فرمایئے۔ اس کا جواب یہ دے دیا جاتا ہے کہ رشوت کہاں نہیں ہے پوری دنیا اس کی لپیٹ میں ہے کہیں زیادہ کہیں کم۔ جب کہا جاتا ہے جناب عالی مہنگائی نے غریب آدمی کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے، کچھ اس کی روک تھام کیجیے۔ اس کے جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مہنگائی پاکستان سے بھی زیادہ ہے۔ مہنگائی کا رونا رونے والے آنکھوں کے اندھے ہیں۔ بوہری بازار، طارق روڈ، جامع کلاتھ مارکیٹ، صرافہ بازار، ریشم گلی شاہی بازار، انارکلی اور باڑہ مارکیٹوں میں جا کر دیکھئے تو ملک میں مہنگائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہا جاتا ہے کہ بے روزگاری بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ بھی گمراہ ہو رہا ہے، اس کے جواب میں ارباب حل و عقد دوسرے ممالک کے اعداد و شمار سے ثابت کر دیں گے کہ اسے مسئلہ بنا کر پیش کرنے والے دنیا کے حالات سے بے خبر ہیں۔ جب کہا جاتا ہے کہ علاقائی اور لسانی تعصب ملک کی جڑوں کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اپنے علاقے اور اپنی زبان سے محبت اور کلچر کے فروغ کا مظہر ہے جب کہا جاتا ہے کہ ملک میں بموں کے دھماکے ہو رہے ہیں سینکڑوں بے گناہ لوگ مارے جا رہے ہیں، کوئی شخص خود کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ ڈاکہ زنی عام ہو چکی ہے، لوگوں کا دن کی روشنی میں اغوا ہو جاتا ہے امن و امان کی حالت ابتر ہے، سرکاری املاک، مکانات اور دکانیں جلا کر راکھ کی جا رہی ہیں۔ ہیروئن اور خون کا ساسلہ میں کھلونوں کی طرح فروخت ہو رہا ہے۔ للہ اس کی طرف فوری توجہ فرمایئے۔ اور اس کا کوئی دارو سبیل کیجئے، نعرہ بلند کر دیا جاتا ہے۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے، اس کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی ہم دہشت گردوں کو... گے۔ انہیں چوراہوں پر پھانسی دے دیں گے۔ لوگ اگر کچھ زیادہ ہی مولزدہ ہیں گروہ اپنی حفاظت

[illegible]

اور ہم سے انتقاد ر۔ ایسا نظر آتا ہے کہ اربابِ حلّ وعقد کسی مسئلہ کو مسئلہ سمجھنے پر آمادہ ہی نہیں ہیں ظاہر ہے ایسی صورت میں اصلاحِ احوال کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

منافقت کی انتہا

سیاسی جماعتیں ہوں یا مذہبی فرقے۔ اربابِ حلّ وعقد ہوں یا عوام الناس دراصل ہم نے متحد و متفق ہو کر منافقت کی زنجیر کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ یہ منافقت نہیں تو اور کیا ہے کہ سینکڑوں عالموں اور ہزاروں مذہبی مدرسوں کی موجودگی میں اور انکے پند ونصائح کے باوجود لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم ہے اٹھتے بیٹھتے قال اللہ اور قال الرسول کا ورد کرنے والے حکمران مظلوموں کی آہ و بکا کیوں نہیں سن پاتے۔ ظالم کے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے ہی ایوانہائے اقتدار میں کیوں لرزہ آنے لگتا ہے۔ اسلامی اخوت کا درس دینے والے عالموں کو اپنے گریبان کیوں چاک نظر نہیں آتے۔ ایک دین کے ماننے والوں نے مساجد پر قبضہ کے لئے خون بہانے کو کیوں روا قرار دیا ہوا ہے سادگی کی تلقین کرنے والے خود کیوں عظیم الشان محلات میں رہتے اور شاندار دعوتوں، اپنے اور اپنے بچوں کی سالگرہ پر لاکھوں روپے خرچ کیوں کر دیتے ہیں۔ مہنگائی کا رونا رونے والے عام لوگ رنگین ٹی وی اور وی سی آر کو کیوں مقصدِ حیات سمجھ بیٹھے ہیں۔ حقوقِ نسواں کی علمبردار خواتین خود کیوں جہیز کی لمبی لمبی فہرستیں لئے گھومتی رہتی ہیں۔ منافع خوری کا رجحان نہیں تو کل کے خوانچہ فروش آج کے خواجہ کیسے بن گئے جن کے پاس کل ایک دوکان نہ تھی وہ آج سپر مارکیٹوں اور کارخانوں کے مالک کیسے بن گئے۔ رشوت اگر ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لئے لی جاتی ہے تو چپراسی اور کلرک بنگلوں اور کاروں کے مالک کیسے بن گئے اور افسروں نے غیر ممالک میں بنک بیلنس کس طرح بڑھا لئے۔ اگر بدعنوانی کا دور دورہ نہیں ہے تو قومی تحویل میں چلائے جانے والے تجارتی اور صنعتی اداروں میں ہر سال کروڑوں روپے کا خسارہ کس طرح ہو رہا ہے۔ اگر قانون بے بس نہیں ہے تو سہراب گوٹھ میں ہیروئن اور اسلحہ کا کاروبار کیوں پھلتا پھولتا رہا۔ معروف قاتل اور دہشت گرد کس طرح کراچی کی سڑکوں پر آزادی سے دندناتے پھرتے رہے او اعلیٰ حکام اور عوامی نمائندوں کے گھروں میں مجرموں کو کس طرح پناہ دی جاتی رہی۔ اگر عوام میں بے چینی اور پریشانی نہیں تو ہر چھوٹا بڑا کلاشنکوف اور ہیروئن کا کاروبار کرنے والے کیوں منصوبہ بندی کر رہا ہے ناجائز اسلحہ طورخم کے راستے داخل ہو کر کراچی تک پہنچ جاتا ہے۔ ہیروئن اور چرس مالاکنڈ اور تونیر میں تیار ہو کر کراچی میں ذخیرہ کر لی جاتی ہے۔ بھارت سے تخریب کار ہتھیاروں کے ساتھ سندھ کے ڈکیتیوں ا تخریب کاری کے مرکز قائم کر لیتے ہیں "خاد" کے ایجنٹ بلا روک ٹوک ریل کی پٹریاں اکھاڑ دیتے ہیں اور ملک میں جس شہر میں چاہتے ہیں بموں کے تجربات کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم ہیں کہ ان میں سے

کو مسئلہ ہی قرار نہیں دیتے اور نہ سنجیدگی سے اس کا سدِباب کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہ دلیل کہ دنیا کے بہت سے نو آزاد ملکوں میں ایسا ہی ہوتا ہے کوئی ایسی دلیل نہیں کہ جسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کر قبول کر لیا جائے۔ رسولِ اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق جس کا مفہوم یہ ہے کہ معاشرہ کفر کے تحت تو قائم رہ سکتا ہے لیکن ظلم کے تحت قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک بڑا اہم معاشرتی اصول ہے جہاں جہاں معاشرتی انتشار برپا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ پاکستان میں بھی معاشرتی انتشار کی اصلی وجہ یہی ہے کہ یہاں معاشرتی عدل موجود نہیں۔

مرض کی تشخیص قرآنِ کریم کا یہ بنیادی قانون ہے کہ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (۴۲/۳۰) "جو مصیبت بھی تمہیں پہنچتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے"۔ اس کی وجہ یا تو تمہاری اپنی ذاتی غلطی ہوتی ہے اور یا اس کا ذمہ دار تمہارے معاشرہ کا غلط نظام ہوتا ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھنے والا ہر شخص مصیبت اور تکلیف کے وقت سوچے گا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ اگر وہ اس کی اپنی غلطی ہو گی تو اس کی اصلاح کرے گا اور اس کا ذمہ دار معاشرہ کا غلط نظام ہے تو وہ اس نظام کو بدلنے کی کوشش کریگا۔

قرآنِ کریم کے متذکرہ بنیادی قانون کے تحت جب ہم اپنا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ایک بڑی سماجی بُرائی جسے غالباً ہم نے نوشتۂ تقدیر سمجھ کر قبول کر لیا ہے وہ ہماری معاشرتی زندگی میں طبقاتی تقسیم کی موجودگی ہے جس میں کسی طبقے کو مراعات یافتہ اور کسی کو مراعات سے محروم گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ مراعات یافتہ ہونے کا مطلب ہمارے ہاں یہ ہو گیا ہے کہ ان پر کسی قانون کا اطلاق نہیں ہو گا اور ان کو اپنے مفادات کے حصول کے لئے ہر قسم کے حربے استعمال کرنے کی آزادی ہو گی۔

دوسری بڑی سماجی برائی، اعلیٰ سطح پر قانون شکنی کا آغاز ہے۔ ——————

جب منزل

پر وہ لوگ قابض ہو گئے جو شریکِ سفر نہ تھے تو پھر برائیوں اور بے اصولوں سے سمجھوتوں کی ابتداء ہو گئی پھر وہ دن ہے اور آج کا دن، بے اصولیوں سے یہی سمجھوتے مصلحتِ وقت کے تقاضوں کا خوبصورت لبادہ اوڑھ کر عصائے گمراہی بنے ہوئے ہماری "راہنمائی" کرتے چلے آئے۔ یہ صورت حال بڑی کربناک ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے کہ ہم نے اپنا کام چلانے کے لئے بہت سی برائیوں سے سمجھوتے کر لئے ہیں یہ سمجھوتے

کرتے ہیں یہ سمجھوتے ہر سطح پر ہوئے ہیں اور اب کیفیت یہ ہے کہ محض افراد اگر بدل بھی جائیں تو بھی معاشرتی خرابیوں کی صورتحال میں کسی بڑی خوشگوار تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی یہ ساری خرابیاں جو ہمیں شدید تشدد، ستانی، اقربا پروری، جانبداری، مفاد پرستی، صوبائی عصبیت، باہمی قتل وغارتگری اور تخریب کاریوں کے شکل میں چہار سمت نظر آ رہی ہیں یہ دو چار برسوں کی پیداوار نہیں ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان کی فصل اب پکی ہے لیکن یہ گذشتہ تیس پینتیس برسوں سے ہمارے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کے درپے تھے تھے مصلحتوں کے تحت ہم نے جانبداری کے جو بیج بوئے تھے اس کے نتیجے میں لاقانونیت کی یہ فصل تو پک کر سامنے آنی ہی تھی، اب محض نمائشی تراش خراش سے اس فصل کو پھیلنے سے روکا نہیں جا سکتا۔

تیسری بڑی سماجی برائی کی جڑ "جماعت اسلامی" ہے جس کی بنیاد ہی نفرت، نفاق، عصبیت اور فرقہ پرستی پر استوار ہے اس فرقہ کی بنیاد مودودی (مرحوم) نے ۱۹۴۱ء میں رکھی تھی۔ آپ اس کی روئیداد جو ترجمان القرآن بابت جون جولائی، اگست ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی ہے ملاحظہ فرمائیے۔

"جماعت اسلامی" کی تربیت جن خطوط پر کی گئی ہے۔ اور اسے جن تعلیمات سے آراستہ کیا گیا ہے اس کا نکتہ یہ ہے کہ "راست بازی وصداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں، جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔"

(ترجمان القرآن مئی ۱۹۵۸ء)

آج معاشرے میں جھوٹ فریب، دھوکا دہی کے جو مظاہرے ہم دیکھ رہے ہیں وہ عملی زندگی کی ضرورت بن کر ہمارے اعصاب پر سوار ہیں اور قانونِ ضرورت کے تحت ہمارا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ آج ہمارا ملک، ظلم، تشدد اور بربریت کی جس آگ میں جل رہا ہے یہ بھی "جماعت اسلامی" ہی کی سلگائی ہوئی ہے۔ یہ جماعت اقتدار پر قبضہ جمانے کے لئے "صالحین" کو جس تعلیم وتربیت سے آراستہ و پیراستہ کرتی رہی ہے، وہ اس کے عزائم کی آئینہ دار ہے۔ قابل توجہ امر یہ بھی ہے کہ جماعت اسلامی نے اسلامی مملکت پاکستان میں "جہاد" کا جو طریقہ تجویز کیا ہے، غیر مسلم حکومت بھارت پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ پاکستان میں اصلاحِ خلق کا طریقہ کار کے متعلق ارشاد ہے۔

"اصلاح خلق کی کوئی اسکیم بھی حکومت کے اختیارات پر قبضہ کئے بغیر نہیں چل سکتی۔ جو کوئی حقیقت میں خدا کی زمین میں فتنہ وفساد کو مٹانا چاہتا ہے اور واقعی یہ چاہتا ہے کہ خلقِ خدا کی اصلاح ہو تو اس کے لئے محض واعظ اور ناصح ہو کر کام کرنا فضول ہے۔ اس کے لئے

اٹھنا چاہیئے اور غلط اصول کی حکومت کا خاتمہ کر کے، غلط کار لوگوں کے ہاتھ سے اقتدار چھین کر صحیح اصولی اور صحیح طریقے کی حکومت قائم کرنی چاہیئے" (خطبات صـ ۲۳۱)

"تم روئے زمین پر خدا کے سب سے صالح بندے ہوئے۔ لہٰذا آگے بڑھو، لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو"

(خطبات صـ ۲۳۵)

یہ خدا کے سب سے صالح بندے کون ہیں؟ یہ ہیں جماعتِ اسلامی کے "صالحین" جو "خود ساختہ شریعت" کے نفاذ کے لئے کراچی سے خیبر تک انتشار برپا کرنے کا عزم کر کے میدانِ کارزار میں صف بستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے شر اور وسوسہ انگیزی سے پاکستان کو محفوظ رکھے۔

ہم نے پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا لیکن آج اپنے گرد و پیش پر غور کریں تو اسلام ہی سب سے زیادہ مظلوم نظر آتا ہے۔ ملک میں ہر قسم کی بدعنوانی اور معاشرے میں ہر نوعیت کے ظلم و استحصال کی موجودگی میں اسلام کا نام عجیب سا لگتا ہے۔ کیونکہ اسلام اور ظلم، اسلام اور ناانصافی، اسلام اور لاقانونیت، اسلام اور غلامی، اسلام اور تحقیرِ انسانی، اسلام اور عدم مساوات، اسلام اور استحصال، اسلام اور ستحدہ قومیت، اسلام اور فرقہ پرستی، اسلام اور سیاسی گروہ بندی، اسلام اور انفرادی مفاد پرستی، اسلام اور قبائلی، خاندانی اور علاقائی عصبیتیں، اسلام اور طبقاتی تقسیم، اسلام اور اقربا پروری، اسلام اور سرمایہ داری، اسلام اور جاگیرداری، اسلام اور جبر و تشدد، اسلام اور فساد انگیزی، اسلام اور بدکرداری، اسلام اور بداخلاقی، اسلام اور بدامنی، اسلام اور عدم تحفظ اسلام اور عدم توازن ایک دوسرے کی ضد ہیں اور جس طرح، صفائی اور غلاظت، روشنی اور تاریکی۔ آبِ حیات اور زہر میں مفاہمت نہیں ہو سکتی اسی طرح اسلام اور شرک میں مفاہمت ناممکن ہے تین خلفاء کی شہادت۔ اسپین کے زوال۔ بغداد کی شکست سلطنت مغلیہ کے زوال سے لے کر مشرقی پاکستان میں ہزیمت تک سے مسلمانوں نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ دکھ تو یہی ہے کہ ہمارے دلوں سے احساسِ زیاں جاتا رہا۔ اس وقت پاکستان جس عذابِ خداوندی میں گرفتار ہے وہ سب اقدارِ خداوندی سے گریز۔ مکافاتِ عمل سے انکار۔ جزا اور سزا سے بے خوفی اور آخرت کی زندگی پر ایمان کے فقدان کا نتیجہ ہے۔

علاج اس کا

یہ انتشار و افتراق اور یہ فسادات جو گذشتہ ڈیڑھ دو برس سے ہمارے ملک کو جہنم زار بنائے ہوئے ہیں۔ یہ وقتی شدتِ جذبات کا اظہار نہیں ہیں۔ وقتی جذبات یوں رہ رہ کر سر نہیں اٹھاتے اس میں یقیناً ظلم کا کوئی نہ کوئی پہلو اور عدل و احسان سے شدید محرومی کا کوئی نہ کوئی احساس ہے۔ جو مسلسل کارفرما ہے۔ دنیا بھر کے انتشار و افتراق اور فسادات کی جڑ انسانوں کا خود ساختہ

نظامِ زندگی رہا ہے جو اکثر اوقات ظلم پر مبنی ہوتا ہے۔ شر تو پیدا ہی شرک سے ہوتا ہے۔ اصل فساد اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسانوں کے درمیان "بندہ و آقا" کی تمیز پیدا ہو جائے۔ تمیزِ بندہ و آقا ہی فسادِ آدمیت ہے۔ خدا کے عطا فرمودہ نظامِ معاشرت اور انسانوں کے وضع کردہ نظامِ معاشرت کی کشمکش ہر دور میں جاری رہی ہے اور آج بھی ساری دنیا میں یہ مختلف سطحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ ہر معاشرتی زندگی کے نظام کی بنیاد افکار پر ہوتی ہے۔ ہر دور میں ایک گروہ ہوتا ہے جس میں شامل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پورا معاشرہ اس لئے وجود میں آیا ہے کہ ان کے سامنے صف بستہ رہ کر ان کے مفادات کی نگرانی، خواہشات کی تکمیل اور جذبات کی تسکین کا سامان مہیا کرے۔ وہ حاکم ہیں اور باقی سب محکوم۔ اس قسم کے اندازِ فکر سے پوری سماجی زندگی میں عملی اعتبار سے ایک عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جیسے جیسے اس عدم توازن کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے دیگر متبادل تبدیلیوں کے راستے کھلتے جاتے ہیں اور پھر یہ ایک ایسے فساد کو جنم دیتے ہیں جس سے انسانیت جھلس کر رہ جاتی ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک انتشار و افتراق اور فسادِ آدمیت کے جہنم سے محفوظ و مامون رہے تو سب سے پہلے ہمیں لَا اِلٰہَ کی منزل کو عبور کرنا ہوگا یعنی انسانوں کے وضع کردہ نظامِ زندگی سے انکار کرنا ہوگا اور اس کے بعد اِلَّا اللّٰہ یعنی اللہ کے مقرر اور متعین کردہ نظامِ حیات کو اپنانا ہوگا۔ یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ اس وقت ملک میں جس "نظامِ شریعت" کے نفاذ کا شور و غوغا بلند ہے یہ بھی خدا اور اس کے رسول کے نام پر انسانوں ہی کا وضع کردہ خود ساختہ نظام کا بُت ہے۔ اس کا خدائے واحد کے عطا فرمودہ نظامِ حیات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ خدائے واحد کے عطا فرمودہ نظامِ حیات کا پہلا ستون احترامِ انسانیت اور اس کے پیشِ نظر عدل و احسان ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم عدل و احسان پر مبنی معاشرتی نظام کو ہر سطح پر پوری دیانت داری کے ساتھ نافذ کریں۔ عدل کے سلسلے میں ایک بنیادی حقیقت کو ہمیں پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ دنیا کے عام تصور کے مطابق، عدالت کا منصب ملک کے مروجہ قوانین کے مطابق متنازع معاملات کے فیصلے کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے جب کوئی فیصلہ مروجہ قانون کے مطابق ہوگا تو اسے مبنی بر عدل کہا جائے گا۔ لیکن اگر وہ قانون ہی "عدل" پر مبنی نہ ہو تو ان کے مطابق فیصلہ مبنی بر عدل کس طرح قرار پائے گا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ملک کا قانون بھی عدل پر مبنی ہونا چاہیئے۔ عدل کیا ہے اور ظلم کیا، اس کے لئے قرآن کریم ایک کسوٹی پیش کرتا ہے اور وہ کسوٹی یہ ہے کہ من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون ۵/۴۴۔ جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتا تو ان ہی لوگوں کو کافر کہا جاتا ہے یعنی اگر کسی حکومت کا قانون کتاب اللہ کے مطابق ہے۔ تو وہ اسلامی مملکت ہے۔ اگر اس

(بقیہ صہ ۶۲ پر)

خُدا اور بندے کا باہمی تعلّق کیا ہے؟

آپ تاریخِ انسانی کے کسی دَور سے گزریئے اور رُوئے زمین کے کسی خطّہ پر نگاہ ڈالیئے، ایک چیز آپ کو بلالحاظِ زمان و مکان، بالعموم تمام نوعِ انسانی میں مشترک نظر آئے گی۔ یعنی کسی بلند و بالا ہستی کا تصوّر، کسی فوق البشر قوت کا احساس، جس کے سامنے جھکا جائے، جس کی پرستش کی جائے، جس سے مرادیں مانگی جائیں۔ جس سے ڈرا جائے۔ جس کے حضور نذرانے پیش کئے جائیں۔ جس کے چرنوں میں شردھا و عقیدت کے پھول چڑھائے جائیں۔ دنیا کے سیاح، مغربی محققین اور مکتشفین، اگر کسی ایسے علاقے میں بھی پہنچے ہیں جہاں، اس سے قبل، کسی باہر کے انسان کے نقوشِ قدم دکھائی نہیں دیئے اور وہاں کے باشندے (تہذیب و تمدن سے قطعاً ناآشنا) یکسر حیوانی سطح کی وحشت و درندگی کی زندگی بسر کر رہے تھے تو اگرچہ وہ اپنی طرزِ بود و ماند اور معاشرت کے ہر گوشے میں باہر کی دنیا سے مختلف تھے، بایں ہمہ، ان کے ہاں بھی کسی غیر مرئی، بلند و بالا قوت کا تصوّر پایا گیا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ مشہور یونانی مورخ پلوتارک (PLUTARCH — AD 42 — 102) اس بارے میں لکھتا ہے۔

> زمین پر چلتے پھرتے تم ایسے شہر بھی دیکھو گے جن کی دیواریں نہیں ہیں۔ ایسے بھی جن میں سائنس کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی۔ ایسے بھی جہاں حکمراں کوئی نہیں۔ ایسے بھی جہاں نہ محلات ہیں، نہ ورزش گاہیں، نہ تھیٹر۔ لیکن تم کوئی ایسا شہر نہیں پاؤ گے جہاں دیوتاؤں کے مندر نہ ہوں۔ جہاں دعائیں نہ مانگی جاتی ہوں۔ جہاں منتیں نہ مانی جاتی ہوں۔ ایسا شہر نہ آجتک کسی انسان نے دیکھا ہے نہ کبھی دیکھنے میں آئے گا۔[1]

اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں اس قسم کی قوت کا احساس ہر جگہ موجود ہے، اسکا تصوّر اور اس کی تفاصیل ہر مقام پر مختلف ہیں۔ ایک ہی ملک میں، ایک قبیلے کا "معبود" دوسرے قبیلے کے معبود سے نہیں ملتا۔ ایک ملک کا "خدا" دوسرے ملک کے "خدا" سے مختلف ہے۔ ایک قوم کا "دیوتا" دوسری قوم کے "دیوتا" سے جداگانہ ہے۔ ایک فرقے کا

تصوّر میں اختلاف

---

[1] "اسلام کیا ہے"۔ از محترم غلام احمد پرویز۔

"ایشور"، دوسرے فرقے کے "ایشور" سے متبائن ہے"

دمن ویندواں مارچ ۲۸ء ایڈیشن صفحہ ۱ از محترم غلام احمد پرویز

کہیں خدا کی حسین وجمیل اور بالحق پیدا کی گئی کائنات کو ایشور کی لیلا کہہ کر اس ڈرامے میں اسے "نٹ راجن" یعنی (CHIEF ACTOR) کا نام دیا جاتا ہے۔ کہیں اسے باپ کہہ کر بیٹے اور روح القدس سے ملا کر تثلیث بنا دی جاتی ہے۔ کہیں مجوسیوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ مستقلاً دو خدا ہیں۔ ایک نیکی کا (یزداں) اور دوسرا برائی کا (اہرمن)۔ غرضیکہ جس قسم کی کسی قوم کی ذہنی سطح، اسی قسم کا اس کے ہاں خدا کا تصور ہو گا۔ لیکن:۔

"قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ جب سے انسان میں تمدنی شعور بیدار ہوا، خدا کی طرف سے، بوساطت انبیائے کرام، وحی کی رہنمائی آنی شروع ہو گئی۔ اس تعلیم کا نقطۂ ماسکہ خدا کے متعلق صحیح تصور تھا اور ظاہر ہے کہ جب اس علم (وحی) کا سرچشمہ ایک ہی (خدا) تھا تو یہ تصور بھی شروع سے اخیر تک ایک ہی ہو گا۔ (اور ایک ہی تھا) لیکن ہوتا یہ رہا کہ ایک رسول آتا اور خدا کے اس بلند و بالا تصور کو نہایت وضاحت سے پیش کر دیتا۔ کچھ عرصے کے بعد، یہ حقیقت لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی اور محسوسات کا خوگر انسان، الوہیت کے اس صاف اور شفاف تصور میں اپنی ذہنی رنگ آمیزی کرنے لگ جاتا۔ کبھی وہ ان چیزوں کو اپنا معبود بنا لیتا جن سے وہ ڈرتا اور خوف کھاتا۔ کبھی ان کو جن سے وہ اپنی کچھ توقعات وابستہ کرتا۔ کبھی ان ذہنی اور خیالی معبودوں کی عظمت و تقدیس کے پیش نظر ان کے مجسمے کھڑے کرتا۔ بت تراشتا۔ چنانچہ یہ مختلف دیوی دیوتا ــــ اندر ــــ اگنی ــــ سورج ــــ چاند ــــ گنگا جمنا۔ سانپ۔ گائے۔ بیل۔ سب اسی جذبۂ خوف و امید (یعنی دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت) کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں۔ جب ذہن انسانی پر اس طرح توہم پرستی کی تاریکیاں چھا جاتیں، تو پھر ایک اور رسول آجاتا اور خدا کے پاکیزہ تصور کو وحی کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دیتا اور انہیں واضح الفاظ میں بتا دیتا کہ انسان اشیائے کائنات کا مسجود ہے، ساجد نہیں۔ اس میں ایسی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں جن کی رو سے یہ اشیائے فطرت کو مسخر کر سکتا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے۔ سمندروں کی شورانگیزیاں۔ پہاڑوں کی گراں سامانیاں تحت الثریٰ کی آتش افشانیاں۔ اوج ثریا کی طلعت آفرینیاں اور نورپاشیاں۔ دریاؤں کی (گاہ) وحشت خیز تلاطم خیزیاں اور (گاہ) سکون افزا روانیاں۔ ہواؤں کی تند و تیز جولانیاں۔ خوفناک صحراؤں کی دہشت انگیزیاں اور حیرت افروزیاں۔ غرضیکہ یہ جملہ کائنات اور اس کے مختلف اور متنوع مظاہر، سب انسان کے سامنے ہاتھ باندھے خدمت کے لئے کھڑے ہیں۔ لہٰذا ان چیزوں کے سامنے جھکنا اور انہیں اپنا آقا اور حاکم تصور کرنا چہ معنے؟

قرآن کا تصور

وحی کا یہ سلسلہ، اسی نہج و انداز سے جاری رہا تا آنکہ جب ذہن انسانی سن شعور کے قریب پہنچ گیا تو خدا

کا یہی پاکیزہ اور منزہ۔ صاف اور شفاف۔ بلند و بالا تصور، ایک مکمل صورت میں، قرآن کے اندر دے دیا گیا اور اس صحیفۂ آسمانی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ چنانچہ اب، خُدا کا صحیح تصور، (جسے خود خُدا نے بیان کیا ہو) اپنی حقیقی اور اصلی شکل میں (جس میں ذہنِ انسانی کی رنگ آمیزی کا شائبہ تک نہ ہو) قرآن کی دفتین کے اندر ہے۔ اس سے باہر کہیں اور نہیں۔" (من ویزداں مارچ ۷۳ء ایڈیشن صفحہ ۵)

انسان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور آنا کیوں ضروری ہے اور قرآن کریم نے کیوں اس شدت کے ساتھ اسی تصور کے اللہ پر ایمان لانے کی یوں تاکید فرمائی ہے کہ:-

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲/۱۳۷)

اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مومنین) تم ایمان لائے ہو۔ تب سمجھئے کہ انہیں زندگی کا صحیح راستہ مل گیا۔

اس کا بنیادی اور اہم ترین سبب یہ ہے کہ جس قسم کا کسی قوم کے ہاں اللہ کا تصور ہوگا۔ اسی قسم کا اُن کا اس سے تعلق ہوگا اور جس قسم کا کسی قوم کا اللہ سے تعلق ہوگا اس قوم کا دوسرے انسانوں سے باہمی معاملات کا ہر گوشہ اسی تعلق کا پرتو ہوگا۔

قرآن کریم نے اللہ کا جو تصور عطا فرمایا ہے اور اس کے نتیجے میں اس پر ایمان رکھنے والوں اور اُن کے اللہ کا جس قسم کا باہمی تعلق بنتا ہے، اُس کی صحیح عکاسی حضور نبی اکرمؐ نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں ان حقیقت کشا الفاظ کو بار بار دہرا کر کر دی کہ اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى اور اس کے تسلسل میں حضور نے آخری بار فرمایا کہ بَلِ الرفیق الاعلیٰ، جس کے بعد اس پُر بہار زندگی کی جوئے رواں دامنِ صحرا سے صحنِ گلستان میں داخل ہو گئی۔

"نبی اکرمؐ کے یہ آخری الفاظ دنیائے انسانیت میں فی الحقیقت حرفِ آخر (LAST WORD) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خُدا اور بندے کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یہ ہے وہ سوال جس کا جواب دنیائے مذاہب کے تمام دساتیر اور جہانِ فلسفہ کے جملہ دفاتر ہیں۔ اگر اُن افسانہ ہائے عہدِ کہن کو چھوڑ بھی دیا جائے جنہیں ذہنِ انسانی نے اپنے بچپن کے زمانہ میں وضع کیا اور جن کی یاد آج بھی مختلف مناظر و صوامع میں پتھر کی مورتیوں کی شکل میں ملتی ہے تو بھی آپ دیکھیں گے کہ مختلف مذاہب میں خُدا کا تصور ایک پرستش کی شے (OBJECT OF WORSHIP) یا حاکمِ مُستبد سے آگے نہیں بڑھتا جو کائنات سے الگ تھلگ شخصی طور پر اپنے احکام نافذ کر رہا ہے اور انسان کے لئے اس کی پرستش کرنا یا طوعاً و کرہاً اس کے احکام کا ماننا ضروری ہے۔ لیکن قرآن خدا اور انسان کے باہمی

تعلق کا ایک جداگانہ اور عجیب و غریب تصور پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خُدا نے اس خارجی کائنات کو خام مالہ کی شکل میں پیدا کیا اور پھر اس میں انسان کو بسایا۔ انسان میں ایسی صلاحیتیں رکھ دیں جن کی رُو سے وہ ان قوانین کا علم حاصل کر سکے جن کے مطابق کائنات کے مختلف عناصر سرگرمِ عمل ہیں۔ جب انسان ان قوانین کا علم حاصل کر لے تو وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکتا ہے۔ خدا نے انسان سے کہہ دیا کہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے، خارجی کائنات اور خود انسانی زندگی کے حسن میں اضافہ کرتا چلا جائے اور اس طرح اُس پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے میں خدا کا دست و بازو بن جائے جسے مشیتِ خداوندی نے متعین کیا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو خُدا اور انسان کا باہمی تعلق رفاقت کا قرار پاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ سارا پروگرام خدا کا متعین کردہ ہے اور انسانی صلاحیتیں بھی اسی کی عطا فرمودہ، اس لئے اس رفاقت میں خدا کا مقام "رفیقِ اعلیٰ" کا ہوتا ہے۔ یہی وہ "رفاقتِ اعلیٰ" کا تصور ہے جس کی طرف نبی اکرمؐ نے اپنے آخری الفاظ میں اس حسن و خوبی سے اشارہ فرمایا اور جو خدا اور بندے کے تعلق کے باب میں فی الحقیقت حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔"

(معراجِ انسانیت، ایڈیشن ۸۴ء صفحہ ۳۹۱ از محترم غلام احمد پرویزؒ)

خدا کا رفیق

خدا سے رفاقت کا تعلق ہمیں حقیقت کے ایک اور اہم گوشے کی طرف لے جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آ جاتے ہیں۔ بعض جلدی سے، بعض بہت دیر میں۔ مثلاً کسی درخت کے بیج میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق اس کی نشوونما کی جائے تو وہ ایک دن تناور درخت بن کر سامنے آ جائے گا۔ یہ نتیجہ ہماری زندگی میں ہمارے سامنے آ سکتا ہے لیکن فطرت کی بعض سکیمیں ایسی بھی ہیں جن کے نتائج ہزارہا سال کے بعد جا کر مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً زندگی کے اوّلین جرثومہ کا مختلف ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد انسانی پیکر تک پہنچنا۔ یہ کہیں کروڑوں برس کے بعد جا کر ہوا۔

لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اگر فطرت کے ساتھ انسان کا ہاتھ شامل ہو جائے تو نہ صرف اُس مُدت میں بہت تخفیف ہو جاتی ہے جس میں کسی عمل نے تنہا فطرت کے قاعدے کے مطابق، نتیجہ خیز ہونا تھا بلکہ اس کے حسن و رعنائی اور افادیت و فاہیت میں بھی بیش بہا اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہی پودہ جو عام حالات میں چھ ماہ کے بعد پھول کھلاتا تھا، اور وہ بھی صرف ایک رنگ کا۔ یورپ کی تجربہ گاہوں میں چوبیس گھنٹے میں، چار چار مختلف رنگوں کے پھول سامنے لے آتا ہے۔ یعنی جب انسان، قوانینِ خداوندی کا رفیق بن جاتا ہے تو خدا کے تخلیقی پروگرام میں تیزی آ جاتی اور نتائج میں حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔

قوانینِ خداوندی کے نتیجہ خیز ہونے کی جو شکل خارجی کائنات میں ہے وہی صورت انسانی دنیا میں بھی ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸)۔ کائنات میں یہ اصول کارفرما ہے کہ یہاں حق و باطل میں کشمکش جاری رہتی ہے۔ اس کشمکش میں حق، باطل کا سر توڑ دیتا ہے اور اس طرح باطل آخرالامر نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ یعنی تعمیری قوتیں آخرالامر تخریبی قوتوں پر غالب آجاتی ہیں اور اس طرح کائنات اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی آگے بڑھتے چلی جاتی ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے "خدا کا ایک ایک دن" ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار (۳۲/۵) اور پچاس پچاس ہزار (۷۰/۴) سال کے برابر ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ انسانوں کی رفاقت شامل ہو جائے تو حق کا یہی غلبہ چند دنوں میں سامنے آسکتا ہے۔ لیکن یہ رفاقت انہی انسانوں کی طرف سے عمل میں آسکتی ہے جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر محکم یقین رکھتے ہوں اور ان کے مطابق اپنی ذات کی نشوونما کے لئے مصروفِ سعی و عمل ہوں (ایمان اور عملِ صالح اسی کو کہتے ہیں) ایسے انسانوں کے گروہ کو جماعتِ مومنین یا حزب اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس جماعت کی سعی و عمل سے ایسا معاشرہ وجود میں آجاتا ہے جس میں قوانینِ خداوندی کم از کم وقت میں اثر انگیز اور نتیجہ خیز ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح افرادِ معاشرہ کی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں

فرد اور معاشرہ

بتا دیا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف جماعت کے اندر (قرآنی معاشرہ میں) ہو سکتی ہے۔ وہ فرد کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي (۸۹/۳۰)۔ جنت میں داخل ہونا چاہتے ہو تو خدا کے بندوں کی جماعت میں داخل ہو جاؤ۔ صادقین کی معیت (كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ۔ (۹/۱۱۹)۔ اس کی بنیادی شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خانقاہیت کی خلوت گاہوں اور زاویہ نشینی کے تجرد کدوں کو ذہنِ انسانی کی اختراع بتایا ہے (۵۷/۲۷) جو خدا کے تجویز فرمودہ دین کے خلاف ہے۔ خدا کا دین، معاشرہ کے اندر قائم ہوتا ہے۔ دین، انسانوں کے باہمی معاملات کے لئے اصول و ضوابط عطا کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی جنگل میں چلا جائے جہاں کوئی دوسرا انسان نہ ہو، تو اسے نہ دین کی ضرورت ہوتی ہے، نہ ایمان کی حاجت۔ نہ اس کی ذات کی نشوونما ہو سکتی ہے، نہ انسانی زندگی کے ارتفاع کی کوئی شکل۔ وہ درحقیقت، انسانی سطح پر زندگی بسر ہی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا، دین، اجتماعیت کا مقتضی ہے اور فرد کی ذات کی نشوونما معاشرہ کے اندر ہی ممکن ہے۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ جب دنیا میں کوئی دو انسان اپنی زندگی کا نصب العین ایک ہی مقرر کر لیں۔ یعنی ان کے سامنے مقصود و منتہیٰ ایک ہو اور جس قالب میں وہ اپنی زندگی کو ڈھالنا چاہیں

وہ بھی ایک ہو، تو ان میں قلب و نگاہ کی ہم آہنگی کا پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ اسی کا نام وحدتِ فکر و نظر، یا ایمان کا اشتراک ہے۔

یہی وحدتِ فکر و نظر ہے جسے قرآن، انسانوں میں وجہِ جامعیت قرار دیتا ہے۔ یعنی دنیا کے دو انسان — وہ کہیں بستے ہوں، ان کا رنگ۔ زبان۔ نسل۔ وطن۔ کوئی ہو۔ اگر وہ صفاتِ خداوندی کو اپنے سامنے

قومیت کی تشکیل

بطور خارجی معیار رکھ لیں اور اس کے مطابق اپنی ذات کی نشوونما کیلئے کوشاں ہوں، تو وہ دونوں انسان رنگ، نسل۔ زبان۔ وطن کے بُعد اور تفاوت کے باوجود، ایک جماعت کے رُکن اور ایک قوم کے افراد ہوں گے۔ قرآن نے قومیت کی تشکیل کے لئے یہی معیار بتایا ہے۔ اس طرح انسانوں میں جو وحدت پیدا ہوتی ہے وہ خون۔ رنگ۔ زبان اور وطن کے رشتوں سے کہیں زیادہ محکم اور پائیدار ہوتی ہے۔ اگر یہی وحدت پھیلتی جائے اور دنیا کے زیادہ سے زیادہ انسان اس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور یک رنگ ہوتے جائیں تو اس سے تمام نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری بن جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی توحید (یعنی اس کی ذات کو بطور معیار اپنے سامنے

وحدتِ انسانیت

رکھنے) کا لازمی نتیجہ وحدتِ انسانیت ہے۔ اس کے سوا وحدتِ انسانیت کی کوئی اور بنیاد نہیں۔ قرآن کا مقصود و منتہیٰ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ تمام انسان خدا کی توحید کو اپنی زندگی کا عملی شعار بنا کر ایک عالم گیر برادری بن جائیں اور اس طرح وہ تمام اختلافات مٹ جائیں جن کی وجہ سے آج دنیا درندوں کا بھٹ بن رہی ہے۔"

(من و یزداں ۱۹۷۴ء ایڈیشن صہ ۱۵-۱۳)

لیکن - اور یہ لیکن انتہائی اہم ہے کہ ایسا کرنے کیلئے قرآنِ خالص کا اتباع نہایت ضروری ہے کہ اس کے سوا کوئی اور در ایسا نہیں جہاں ہماری دادرسی ہو سکے۔ اجازت دیجئے کہ ہم علامہ اقبالؒ کے اس مقالہ کا اقتباس بارِ دگر پیش کریں جسے طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں کاملاً آپکے سامنے لایا گیا تھا یعنی "تصوف شعبدہ بازوں کی کمند"

"واضح ہے کہ اسلام کا آفتاب تاریخ کے روزِ روشن میں افق پر جلوہ گر ہوا۔ ہمارے جمہوریت پرور پیغمبرِ اعظمؐ نے عاقل و دانش اصحابؓ میں زندگی بسر کی اور انہی میں کام کرتے رہے۔ ان اصحابؓ نے ایک ایک لفظ آنیوالی نسلوں تک پہنچا دیا جو اس پیغمبرِ اعظمؐ کی مقدس و بابرکت زبان پر جاری ہوا۔ حضورؐ کی تعلیمات میں کوئی بھی چیز نہیں جسے مخفی کہا جا سکے۔ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ زندگی کی مسرت اور روشنی سے لبریز ہے۔ یہ تاریک اور قنوطیت افزا تصوف کیلئے وجہ مہیا کرنے ہی سے پاک و مبرا نہیں بلکہ ان تمام مذہبی تعلیمات کے خلاف کھلا ہوا جارحانہ اقدام ہے جنہوں نے صدیوں تک عالمِ انسانیت کو مبتلائے فریب رکھا۔"

(ماہنامہ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۸۷ء صہ ۱۴)

ترتیب و پیشکش: محمد عمر دراز

محترمہ ثریا عندلیب

دین کی باتیں

جو قوم کسی مقام پر رُک کر کھڑی ہو جائے، وہ زندگی کی حرارتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ جامد قوم ایک مقام پر ہی کھڑی نہیں ہوتی۔ بلکہ غور سے دیکھا جائے تو وہ پیچھے ہٹ رہی ہوتی ہے، کیونکہ چلنے والی قومیں اس سے بہت آگے بڑھ جاتی ہیں۔ حضور نبی اکرمؐ کا ارشادِ گرامی ہے۔ مَنِ استوٰی یوماہ فھو مغبون۔ جس نے زندگی کے دو دن ایک جیسے گذارے وہ تباہ ہو گیا۔

انسانی خواہشات اور جذبات قابلِ نفرت نہیں، ان کا غلط استعمال انسان کو تباہ کر دیتا ہے۔ اگر انہیں خدا کی راہنمائی کے تابع رکھا جائے، تو ان سے عظیم تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

عبدِ مومن جس کام کا بھی ارادہ کرتا ہے اس سے اس کی غایت الغایات یعنی منتہائے مقصود یہ ہوتا ہے کہ خدا کی صفت رحمانیت و رحیمیت مشہود اور کارفرما ہو جائے۔

خدا تعالےٰ کی استعانت غاروں، خانقاہوں، حجروں اور خلوت کدوں میں حاصل نہیں ہوتی۔ یہ نظامِ خداوندی کے اجتماعی پروگرام میں حاصل ہوتی ہے۔

خدا کا صحیح تصور اس کی اُن صفات کی رُو سے سامنے آسکتا ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں، کیونکہ ان میں انسانی خیالات اور تصورات کی آمیزش نہیں ہوتی۔

کفر کی رُو سے انسانی زندگی صرف اس دنیا کی زندگی ہے۔ اس لئے اس میں نفع وہ ہے جس سے دنیاوی مفاد حاصل ہوں اور نقصان وہ جس میں یہ مفاد حاصل نہ ہوں۔ انسانی ذات کے نفع نقصان کا اس زندگی میں کوئی تصور نہیں ہوتا۔

دین جب مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس میں نہ دنیاوی مفاد حاصل ہوتے ہیں نہ انسانی ذات کے مفاد۔ اسے قرآن دنیا اور آخرت دونوں میں نقصان سے تعبیر کرتا اور خسرانِ مبین کہہ کر پکارتا ہے۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ اگر حق و باطل کی آویزش میں ایسا مقام آجائے جہاں دنیاوی مفاد اور انسانی ذات کے مفاد میں ٹکراؤ یا تصادم پیدا ہو تو اس وقت دنیاوی مفاد کے مقابلے میں انسانی

ذات کے مفاد کو ترجیح دینا چاہیئے۔ اسی کو قرآن کریم کی اصطلاح میں "دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دینا" کہتے ہیں۔

انسان خدا کا عبد بننے کے بعد ہر قسم کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس عبدیت کو قرآن نے سجدۂ خداوندی سے تعبیر کیا ہے۔

آستانِ خداوندی پر سر جھکا کر دنیا کے بڑے سے بڑے آستانہ سے مستانہ وار سرفراز و بے نیاز گزر جانا، یہ ہے اس سجدہ کا نتیجہ جو بارگاہ خداوندی میں ادا کیا جاتا ہے۔ یعنی خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا نتیجہ۔

یہ کتاب حکیم انسانوں کو اس لئے دی گئی تھی کہ وہ قیامت تک کے لئے اسے اپنا نصاب زندگی بنائیں اور اس کے قوانین کے تابع چلیں۔

ہم جادو کو مانتے ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ ہم اسے جادو نہیں کہتے۔ اس کی جگہ ہم نے اس کے بڑے مقدس نام رکھ لئے ہیں۔ یہ وردو وظائف۔ یہ گنڈے تعویز یہ مراقبے اور یہ ریاضتیں اسی حقیقت کے مظاہر نہیں تو اور کیا ہیں؟

سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم نے بھی اپنے متعلق یہ کہا ہے کہ میری فلاں آیت یا فلاں لفظ کو اتنی مرتبہ پڑھ لینے یا اس کا ورد کر لینے سے فلاں نتیجہ برآمد ہو جائے گا؟

اگر کوئی شخص تعزیرات پاکستان کی اس دفعہ کے الفاظ کو جس میں (مثلاً) لکھا ہے کہ چوری کی سزا تین سال کی قید ہے دس ہزار مرتبہ پڑھ کر پھونکے کہ اس سے چور کا سراغ مل جائے تو اسکے متعلق آپ کیا کہیں گے؟

قرآن کریم قوموں کے امراضِ کہن کے لئے نسخۂ کیمیا ہے۔ ایک ضابطۂ قوانین ہے۔ جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو انفرادی اور اجتماعی شرف و مجد حاصل ہو جاتا ہے لیکن اگر اس نسخۂ کیمیا کو کاغذ پر زعفران سے لکھ کر گھول گھول کر پیا جائے یا اس ضابطۂ قوانین کی مختلف دفعات کے چلّے کاٹے جائیں، تو اس سے بڑھ کر اس کتاب حکیم کا غلط مصرف اور کیا ہوگا؟

بحیثیت ایک معاشرے کے ہماری تخلیق اس حقیقت پر مبنی ہے کہ اجتماعی ترتیب و تنظیم میں نسل و زبان کے امتیازات پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا جائے۔ یہ مقصد اسی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس نظامِ شریعت کے تابع رکھیں جو تماماً مبنی بر وحیٔ خداوندی ہو۔

وحی کی رہنمائی نہ کبھی کسی کا ساتھ چھوڑتی ہے نہ کبھی کسی کو دھوکا دیتی ہے۔

وحی کی روشنی ناکام تجارب کی تلخ کامیوں سے بھی محفوظ رکھتی ہے اور وقت کی طنابیں بھی کھینچ دیتی ہے۔ قوانینِ فطرت کو سامنے رکھ کر حسنِ انتظام اور معاشرہ میں عادلانہ نظام سے طبعی حوادث کا مقابلہ آسانی سے ہو جاتا ہے۔

یہ تمام سلسلۂ کائنات خدا کے قوانین کے تابع سرگرمِ عمل ہے اس نے اُسے بنایا ہی اس انداز سے ہے کہ ہر حادثہ اس پروگرام میں بالکل فٹ بیٹھتا ہے۔

اکلِ حلال کی اگر تمیز اٹھ جائے تو انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔

انسان کو 'حدود' اس لئے دی گئی ہیں کہ وہ دوسرے انسان کی حفاظت کرے۔ جہاں صرف اپنے اپنے فائدے کے لئے سوچا جائے اور 'حدود' کوئی ہوں نہیں تو اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ قومیں جو تباہ ہوئیں یہ نہیں کہ ان کے پاس عقل و بصیرت نہیں تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ سوچتے سمجھتے نہ تھے۔ تھا یہ کہ انہوں نے حدودِ خداوندی کو مٹا دیا تھا۔

قرآن کی رُو سے کوئی اس قسم کی مخلوق نہیں جو انسان سے چمٹ جائے۔ انسان ہی انسان سے چمٹتے ہیں جب توہم پرستی شدت اختیار کر جائے تو لگا ہوں کو یوں نظر آتا ہے جیسے سچ مچ ہی کوئی جن کھڑا ہو۔

دین اسلام میں داخل ہونے کے لئے قرآن یہ شرط قرار دیتا ہے کہ جو کچھ محمدؐ پر اتارا گیا اس پر ایمان لائیں۔ خارج از قرآن کسی اور چیز پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں۔ کیونکہ صرف یہی صداقت ہے جو خدا کی طرف سے ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔

جبر اور اصول پرستی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اگر آپ نے سچ بولنے کی اپنے اوپر پابندی عائد کی ہے۔ تو یہ جبر نہیں۔ اصول پرستی ہے۔ "جبر" وہ ہے جسے خارج سے نافذ کیا جائے۔ یعنی اپنی مرضی سے اختیار کردہ پابندیاں، اصول پرستی اور دوسروں کی عائد کردہ پابندیاں جبر ہوتی ہیں۔

خدا تعالےٰ اپنی قوت و غلبہ کا مظاہرہ انسانوں کے ہاتھوں کراتا ہے جو اس کا مقصد پورا کرنے میدان میں آجاتے ہیں۔ وہ جماعت جس کے ہاتھوں سے خدا نے سب کچھ کرانا تھا۔ وہ اب موجود نہیں اگر موجود ہوتی تو ہم اسرائیل کے سامنے سرنگوں نہ ہوتے۔

تخلیق، حقائق کی گہرائیوں میں اُترنے سے ہوتی ہے۔

کائنات اس قدر مربوط ہے کہ انسان یہاں انگلی ہلاتا ہے تو اس کی زد کہکشاں پر جا کے پڑتی ہے۔ رات کی تاریکی میں تو آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ رسّی کو سانپ سمجھ لیں یا سانپ کو رسّی۔ روشنی میں ایسا نہیں ہو سکتا۔

یہ آیۂ جلیلہ قولِ فیصل ہے اس بارے میں کہ حضور نبی اکرمؐ پر اللہ کی وحی صرف قرآن کے اندر ہے۔
لہٰذا اپنی زندگی کے ہر پیش آمدہ معاملہ میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کے مطابق فیصلہ طلب کرنا ایمان ہے اور اس کے برعکس قرآن کے مطابق فیصلہ طلب نہ کرنا کفر۔
اور جب قرآن سے فیصلہ طلب کیا جائے تو:۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ ۹/۱۷

بلاشبہ یہ قرآن انسانیت کو سفرِ زندگی میں وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ توازن بدوش اور سیدھی ہے۔
اقبالؒ کے اس ارشاد کے مطابق، اگر تم مسلمان بن کر جینا چاہتے ہو (یہی ایمان ہے) تو ایسا قرآنِ کریم کے اتباع کے بغیر ناممکن ہے:۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن (اقبالؒ)

بقیہ: پاکستان چل رہا ہے از صفحہ ۵۲

کے مطابق نہیں تو وہ کافرانہ حکومت ہے۔ جو قانون کتاب اللہ کے مطابق ہوگا وہ مبنی بر عدل ہوگا، جو اس کے خلاف ہوگا وہ ظلم پر مبنی ہوگا۔ نظامِ عدل کے قیام کے لئے، پہلی شرط یہ ہے کہ اس مملکت میں اختیار و اقتدارِ اعلیٰ صرف ایک اتھارٹی کا ہو۔ اگر اس میں ایک سے زیادہ اربابِ اقتدار ہوں گے۔ تو نظامِ عدل کبھی قائم نہیں ہو سکے گا۔ یہ اختیار و اقتدار، کسی شخص یا اشخاص کی جماعت کو اپنے طور پر حاصل نہیں ہوگا۔ یہ اختیار صرف قانون کو حاصل ہوگا یعنی اس نظام میں فرمانروائی صرف قانون کی ہوگی اور مرکزی اتھارٹی کا کام قانون کو نافذ کرنا ہوگا، اپنی مرضی چلانا نہیں۔ انسانی نظامِ عدل میں خدا کی حکمرانی کے معنی ہوں گے اس کی کتاب کی حکمرانی۔
اجتماعی زندگی میں امن و سلامتی اور خیر و فلاح کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ افراد میں ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کیا جائے اور اسے برقرار رکھا جائے اور اس کے لئے "حکمران طبقہ" کو نمونہ بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے۔ اور جب ایثار و قربانی کی بات کی جاتی ہے تو اس میں جذبات، خواہشات اور مفادات کی قربانی سرفہرست ہوتی ہے اس کے بغیر معاشرتی زندگی میں عدل و احسان کا نظام قائم نہیں ہو سکتا۔